ن۔م۔دانش

بچے، تتلی، پھول

شاعری

بچے تتلی پھول

ن۔ م۔ دانش

ناشر:

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار۔ کراچی

فروغ ادب کے لیے باکفایت پیپر بیک کتابی سلسلہ پہلا سیٹ

اس سیریز میں شامل کتب

واہ برطانیہ	سفرنامہ	قمر علی عباسی
رکے ہوئے ساون	گیت	اسد محمد خان
زخم دل	ناول	ابوالفضل صدیقی
میں شاخ سے کیوں ٹوٹا	افسانے	آصف فرخی
بچے تتلی پھول	شاعری	ن - م - دانش
مٹھی بھر ستارے	ناول	رفیق شامی
سارے کام ضروری تھے	شاعری	حارث خلیق

Bachay, titli, phool

(poetry)

by

Noon - Meem - Danish

ISBN 969-441-020-7

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب
بچے تتلی پھول
شاعری
از
ن - م - دانش

اشاعت اول
1997

ناشر و طابع
فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار کراچی
email: fazlee@tarique.Khi.sdnpk.undp.org

تقسیم کار
فضلی بک سپر مارکیٹ
4- ماما پارسی بلڈنگ ٹمپل روڈ اردو بازار کراچی

تزئین ' بالاچ اور عائشہ ماہ رنگ کے نام
جو میرے لیے روشنی ہیں

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1۔	ایک شعر	۱
2۔	اک جنگل ہے اس جنگل میں	۲
3۔	لوگ سہمے ہوئے اک عجب	۳
4۔	بس اک دھند لکے کا سماں	۴
5۔	نشاط و رنج و غم کی ہر کہانی	۶
6۔	خیال و خواب میں ہونا	۸
7۔	جہاں وہم و گماں ہو جائے	۹
8۔	دل کو تیرے دھیان میں رکھا	۱۱
9۔	گھرے تھے ابر کھل کر پھول	۱۳
10۔	دروازے کے باہر نظم	۱۴
11۔	آدمی کو کتنا جینا چاہیئے نظم	۱۶
12۔	کتابھو نکتا ہے نظم	۱۸
13۔	آنکھوں سے اوجھل دنیا کے لیئے نظم	۲۰
14۔	ٹنڈو آدم کا مسئلہ نظم	۲۲
15۔	اجاڑ آنکھوں میں رت جگوں	۲۴
16۔	وہ دور خوابوں کے ساحلوں میں	۲۶
17۔	یہ کیا رت اب کی رت	۲۸
18۔	مجھے اڑتے پرندے اچھے نظم	۲۹
19۔	دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن	۳۱
20۔	وہ دیپ آنکھوں میں جل بجھا	۳۳

21- سب کچھ مان لیا کرتے تھے ۳۴

22- تجھ سے بچھڑ کے کیا کہیں ۳۵

23- جانے کن لمحوں کو صدا دی ۳۶

24- دیا جلایا اپنے آپ سے باتیں کیں ۳۷

25- کوئی پرچھائیں زیرِ آسماں ۳۸

26- تیرا خیال بہت دیر تک ۳۹

27- اک جان ہے اس جان سے ۴۰

28- کوئی دوست ہوتا نظم ۴۱

29- ہر روز ہم اپنے خوابوں نظم ۴۴

30- زندگی خواب میں رونما نظم ۴۶

31- جنہیں ہم کہہ نہیں پائے ۴۸

32- یہ دل ہے گم کسی کے انتظار ۴۹

33- کبھی یادِ یارِ بہار ۵۰

34- ہجر کے موسم تنہائی ۵۲

35- یہ دن یہ رات یہ لمحے ۵۴

36- یہ دل اب بھی خواب ۵۵

37- کوئی غم نہیں ہے نظم ۵۷

38- دوسرا کنارا نظم ۵۹

39- کبھی گزرے دنوں کے رنج ۶۲

40- حقیقت خواب جیسی ہے ۶۳

41- کورا برتن نظم ۶۵

42- گردشِ ساغر سبو کے درمیاں ۶۷

43- رات درپیش تھی مسافر کو ۶۹

44- شہر کا راستہ عجیب سا ہے ۷۱

45- آنکھ میں دل کی اداسی ۷۳

46-	حال غم دل اس سے کہا	۷۵
47-	سراب زندگی میں شام ہو گئی	۷۷
48-	جل رہا تھا ایک منظر آگ میں	۷۸
49-	کبھی تمہاری راہ میں	۸۰
50-	دیا جلا ہے درمیان	۸۱
51-	سورج چاند ستارے مرتے	۸۳
52-	آدم کے بیٹے نظم	۸۴
53-	بدصورتی کا حسن نظم	۹۰
54-	احتجاج نظم	۹۳
55-	ٹوٹتے بجھتے ستاروں کا سماں	۹۶
56-	راستہ چلتے ہوئے کچھ بھول	۹۸
57-	ایسا لگتا ہے جہاں کے	۱۰۰
58-	ملال یہ نہیں دیوار و در	۱۰۲
59-	ہیں جہاں بھر کی مسافتیں تیرے	۱۰۳
60-	یادیں پاگل کر دیتی ہیں	۱۰۴
61-	(دو شعر) خوں بہنے کا شور	۱۰۵
62-	ان کہی کا دکھ نظم	۱۰۶
63-	زندگی اتنی آساں نہیں نظم	۱۰۷
64-	لیاری نظم	۱۰۹
65-	کوئی سایا اچھے سائیں	۱۱۳
66-	وہ دنیا اور ہوتی ہے جہاں	۱۱۵
67-	رات گئے تک جاگتے رہنا	۱۱۶
68-	میں تنہائی گھرے سائے	۱۱۷
69-	(تین شعر) اب یہ کھلا وہ سارا	۱۱۹
70-	قربتوں میں بھی ہے دوریوں	۱۲۰

71-	ایک دشمن کے لیے نظم نظم	۱۲۱
72-	خوش رہنے کی بہت سی باتیں نظم	۱۲۲
73-	میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں نظم	۱۲۵
74-	سایا نہ سائے کا پتہ پھر بھی	۱۲۷
75-	یہ اجاڑ تنہائی کونسی نئی شے ہے	۱۲۹
76-	شام کی ہوا چلی اور دل اداس تھا	۱۳۱
77-	گزرے سفر کے عکس میں دیکھا	۱۳۳
78-	جانے کیسا غم ہے خالی کمرے میں	۱۳۵
79-	سنا ہے میں نے یہ اوروں سے	۱۳۷
80-	یہ سلسلہ بھی خواب اور دل	۱۳۹
81-	گلیوں کی بس خاک اڑا کے جانا ہے	۱۴۱
82-	جل بجھا رات کے سناٹے میں	۱۴۲
83-	امید نظم	۱۴۴
84-	یادیں نظم	۱۴۵
85-	نفی نظم	۱۴۶
86-	انا نظم	۱۴۷
87-	فریب نظم	۱۴۸
88-	اچھی آنکھوں والی کے لیے نظم	۱۴۹
89-	دل میں جو تصویر دکھائی دیتی ہے	۱۵۱
90-	یاد آئے ہیں یار دیرینہ	۱۵۲
91-	(دو شعر) اکیلی شام بہت ہے	۱۵۴

۱

اظہاریہ

اپنی کتاب یا اپنے بارے میں لکھنے سے زیادہ مشکل کام شاید ہی کوئی میرے لئے رہا ہو۔ وہ کتاب جس کی اشاعت آصف فرخی کی محبت یا جنون کا نتیجہ ہے ورنہ شاید ایک آدھ سال بعد مجھے یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ہے کہاں۔ ادب اور علم سے اپنے جنون کی حد تک لگاؤ یا محبت کے باوجود اپنی شاعری اور مجموعی طور پر پورے تخلیقی عمل کے بارے میں ایک عجیب بے اعتنائی بلکہ ایک لاتعلقی میرے اندر پیدا ہو رہی تھی۔ مجھے یہ سوال پریشان کر رہا تھا ایسے معاشرے میں لکھنے کا جواز کیا ہے جو عملاً اور حقیقتاً تخلیقی سطح پر بنجر اور اپنے رویہ اور کردار میں علم دشمن ہے جس کے معیارات علم و ادب کی دنیا میں بھی انتہائی شخصی اور ذاتی ہیں۔ جہاں سیاسی جماعتوں سے بدتر "گروہ بندیاں" ہیں (اگر یہ گروہ بندیاں کسی بھی سطح پر واقعی علمی و ادبی ہوتیں تو اور بات تھی) جہاں اپنے "حلقہ ارادت منداں" میں شامل "بونوں" کی مدح سرائی محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ اس کے دربار سے وابستہ ہیں۔ جہاں شاعر و ادیب کم اور شاعر و ادیب کا رول کرنے والے زیادہ ہیں۔ جہاں کسی شاعر یا ادیب کو محض اس کی تخلیق کی بنیاد پر دریافت نہیں کیا جاتا بلکہ مراسم و تعلقات کی بنیاد پر اس پر صفحے کالے کیئے جاتے ہیں۔ جہاں کوئی کتاب بغیر کسی معروف نام کے فلیپ، مقدمہ، دیباچہ یا پیش لفظ کے اپنی کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے۔ جہاں تنقید کے نام پر آموختے دہرائے جاتے ہیں۔ جہاں اپنے حلقے سے باہر کے کسی بھی ادیب و شاعر کو صرف "رد" کرنے کی روایت ہے جہاں "ادب کا کھیل" بہت سے کھیلوں کی طرح محض ایک کھیل ہے جس کا حاصل ایک جعلی، غیر مصدقہ، ذہنی اور نفسیاتی تسکین کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جہاں صرف معروف ہونا بڑا اہم اور عظیم ہونے کی دلیل ہے اور اس "عظمت" کے پیچھے بھی غیر ادبی سرگرمیاں اور تعلقات اور دیگر ذرائع کار فرما ہیں۔ جہاں ادب فرد کے وجود کا حقیقی داخلہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اپنی بے مائیگی اور خالی پن کو ڈھکنے اور بھرنے کی ایک ایسی "عامیانہ" سرگرمی ہے جسے ہر وہ شخص اختیار کر سکتا ہے جو تعلقات عامہ کا ماہر، واسط درجے کی ذہنی استعداد اور اس سے بھی کمتر درجہ پر تخلیقی صلاحیت و اہلیت کا مالک ہے۔ جہاں "ادبی اسٹیبلشمنٹ" سرٹیفکیٹ نہ دے تو تخلیق کار معتبر

ہی نہیں ٹھہرتا اور یہ اسٹیبلشمنٹ تخلیق کی بنیاد پر سرٹیفیکٹ نہیں بانٹتا ہے بلکہ برادری اور گروہ کی بنیاد پر بانٹتا ہے۔ جہاں کوئی بھی ذہین اور اوریجنل تخلیق کار اپنے تخلیقی دور کے چند سالوں کے بعد، ادبی جگادریوں کے رویوں کی وجہ سے ایک عام قاری میں تبدیل ہو جاتا ہے کیوں کہ اسے پبلک ریلیشننگ نہیں آتی ہے۔ جہاں کتاب کی اشاعت کے لئے تھرو پراپر چینل آنا ضروری ہے یعنی دو چار جید قسم کے ادبی پرچوں کے مدیران سے "برخوردارانہ" بلکہ خوشامدانہ روابط کے ساتھ دس پندرہ سال تک ان پرچوں میں باقاعدہ اشاعت (خواہ تخلیقات کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو) پھر اس کے بعد کتاب۔ یہ ہے باقاعدہ اور مستند شاعر اور کتاب کا معیار۔ اس طرح سے آنے والی کتاب "تھرو پراپر چینل" ہوگی۔ یعنی باقاعدہ نکاح کے بعد کی اولاد۔ اس سے ہٹ کر دوسری کتابوں کے ساتھ ہمارے نقادوں کا رویہ وہی ہے جو معاشرہ کا کسی بغیر نکاح کے اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ گذشتہ آٹھ دس سالوں میں نوجوان شاعروں کی شائع ہونے والی کتابوں کے ساتھ "سلوک" سے لگایا جاسکتا ہے (میرا خیال ہے مجھے نام گنوانے کی ضرورت نہیں ہے) لیکن تخلیق کار کا رشتہ قاری سے ہوتا ہے اگر تخلیق میں جان ہے تو قاری اسے ضرور دریافت کرلیتا ہے ورنہ نقاد نہ شاعر بناتا ہے اور نہ ہی دریافت کرکے سامنے لاتا ہے۔ البتہ بہت سے معمولی درجے کے شاعروں کو انہوں نے مزید خراب ضرور کیا ہے۔ شعر کہنا میرے لئے محض ایک سنجیدہ عمل ہی نہیں ہے بلکہ ایسا عمل بھی ہے جس سے زندگی بامعنی بنتی ہے۔ ایک ایسی دانشورانہ سرگرمی ہے جس میں کسی بھی طرح کی بددیانتی، جھوٹ اور مصلحت کا مطلق گزر نہیں ہے۔ یہ وہ سچ ہے جو آدمی اپنے آپ سے، اپنے معاشرے اور اپنے عہد سے بولتا ہے لیکن کیا ہم؟ کیا ہمارا معاشرہ اور کیا ہمارا عہد؟ سب جھوٹ ریا اور مصلحت کے دبیز چادر میں لپٹے ہوئے ہیں تو آدمی کس سے سچ کہے اور کیوں؟

میری نسل جس نے شعور کی پختگی کے تمام مراحل کو ۷۷ء کے مارشل لاء کے زمانے میں طے کیا۔ مارشل لا، ریاستی جبر، ہر طرح کی بندشیں جس نے میری نسل میں صرف ایک غصہ اور فرسٹیشن بھر دیا تھا۔ لیکن ہمارا فرسٹریشن ہمارے غصے پر حاوی ہوگیا۔ اس لئے ذاتی وداخلی دکھ اور اس کا اظہار، کچھ غزل کے مخصوص مزاج کے سبب بھی، غزل کا ڈومی نیٹ DOMINANT موضوع رہا۔ اس پر مزید طرہ ہمارا تنقیدی مزاج اور رویہ

جس سے ہم غزل، نظم اور مجموعی طور پر شاعری کو دیکھتے ہیں وہ اب بھی کسی نئے تجربے، اظہار کے کسی نئے سانچے، نئے اسلوب و لفظیات کو باسانی قبول نہیں کرتا اب بھی ہمیں "سند" چاہیے گو کہ ہم زبان سے اس کا اظہار نہیں کرتے لیکن "سند" ایک ذہنی رویے کے طور پر اب بھی ہماری شعری اور تنقیدی مزاج پر مسلط ہے۔ اس لئے نیا شاعر محض "رد" کئے جانے کے خوف سے مروجہ شعری اور تنقیدی مزاج کے مطابق شعر کہنے لگتا ہے۔ آخر اس کو "قبولیت" کی بھی تو ضرورت ہے۔

میں نے بھی شعر کہے، کچھ چیزیں مختلف اوقات میں اشاعت کے لئے پرچوں میں بھیجیں اور پھر خود ہی ان کو رد کرنا شروع کر دیا۔ انہیں مکمل طور پر قارئین کے سامنے پیش کئے بغیر۔ دراصل تخلیقی عمل پر اعتماد زندگی اور معاشرہ پر اعتماد سے جڑا ہوا ہے۔ جہاں زندگی پر اعتماد نہ رہے وہاں ہر عمل بے معنی ہو جاتا ہے کیا سیاست اور کیا ادب، آرٹ اور فلسفہ۔ ہماری پچاس سالہ سیاسی تاریخ نے جس نسل کو جنم دیا ہے وہ خلا میں سانس لے رہی ہے اس کے پاس زندگی کرنے کے لئے اجتماعی سطح پر کوئی بامعنی قدر نہیں ہے۔ وہ اپنے سیاسی تاریخ کے تضادات اور دروغ گوئی کا منطقی نتیجہ ہے اس نسل کی آنکھیں اور دل اجتماعی خوابوں سے عاری ہیں جس کے پاس صرف فرسٹریشن اور غصہ ہے۔

میرا تعلق لیاری سے ہے۔ جس کی اپنی الگ ایک دنیا ہے۔ جہاں مختلف ذات، برادری اور قومیتوں کے لوگ اس طرح رہتے ہیں جیسے وہ سب ایک ہی خاندان کے ہوں۔ اس لئے کراچی کے بدترین فسادات کے زمانے میں بھی یہ علاقہ سکون اور پر امن رہا۔ لیاری کے بارے میں عام تصور یہی ہے کہ یہ نچلے طبقے یا نچلے متوسط طبقے کی آبادی ہے۔ ایک زمانے میں یہ بات درست تھی لیکن اب نہیں۔ نچلے طبقے کی آبادی ہونے کی وجہ سے یہاں وہ سارے مسائل موجود تھے جو ایسی آبادی میں ہوتے ہیں۔ یعنی گندگی، غلاظت اور دوسرے بنیادی مدنی (بلدیاتی) مسائل سے لے کر بے روزگاری (جو اب بھی عام ہے) اور منشیات تک یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ پاکستان بھر کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں ترقی پسند سیاست کے، مراد پیپلز پارٹی نہیں، حوالے سے بہت آگے تھا۔ کراچی میں بیشتر ترقی پسند جماعتوں کے ورکرز، پیپلز پارٹی کے علاوہ جتنے لیاری میں تھے اتنے شاید پورے کراچی میں نہیں تھے۔ اس لئے اپنے علاقے کے مدنی و معاشرتی مسائل سے لے کر قومی اور بین الاقوامی مسائل تک اور مارشل لاء

وجمہوریت سے لے کر سوشلزم تک یہاں کے طالب علموں اور عام سیاسی ورکرز کا موضوع بحث تھے۔ اور کسی بھی فعال (ACTIVE) طالب علم کا ان معاملات میں شمولیت جیسے ناگزیر تھا تو میں کیسے بچتا۔

اپنی اس ترقی پسندی کے باوجود میں نے ادب میں ترقی پسندی کو محض ایک کلیشے کے طور پر قبول نہیں کیا۔ ترقی پسند ادب کا وہ تصور میرے لئے کبھی قابل قبول نہیں رہا۔ جس میں ہیئت اسلوب' اور ٹیکنیک کی سطح پر کسی بھی تجربے کو محض رجعت پسندانہ قرار دے کر رد کیا جاتا رہا ہے میرے لئے کسی بھی ادبی تخلیق کو پرکھنے کے معیارات "ادب کے اندر" سے طے ہوتے ہیں باہر سے لاگو نہیں کئے جاتے ہیں۔ بلکہ ایک عرصے تک مجھے اس مسئلہ نے پریشان رکھا کہ ادب کے تنقیدی معیارات اور اقدار خود مکتفی نہیں بلکہ طفیلی ہیں۔ یعنی حقیقت یا سچائی کا تصور پہلے ہم فلسفہ' سائنس یا سماجی علوم کے کسی دوسرے شعبے سے اخذ کرتے ہیں پھر اس کا اطلاق ادب اور آرٹ پر کرتے ہیں۔ کہ یہ ہے صداقت یا حقیقت کیوں کہ فلسفہ' سائنس' نفسیات یا کسی اور سماجی علم نے صداقت یا حقیقت کا یہ تصور دیا ہے۔ اس بدعت کا آغاز افلاطون سے ہوا اور مارکس و فرائڈ سے لے کر کلاسیکی وجودیت تک ہم یہی کام کرتے رہے کہ پہلے صداقت یا حقیقت بلکہ زندگی کا بھی مستعار تصور کہیں سے لیا پھر اسے ادبی تخلیقات میں تلاش کرتے رہے۔ حالانکہ عظیم فن کاروں نے زندگی حقیقت اور صداقت کا جو تصور دیا ہے وہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کسی فلسفی کا تصور ان کی بات بھی اتنی ہی صحیح یا غلط ہے جتنی کسی فلسفی کی۔ تو پھر فلسفی کے تصور حقیقت' صداقت یا زندگی کو کیوں بنیاد بنایا جائے فن کار کے تصور کو کیوں نہیں؟ بد قسمتی سے ہم آرٹ کو فلسفیانہ یا سیاسی تصورات کی تشریح و توضیح کی ایک شکل سمجھتے رہے ہیں۔ جبکہ فن کار ہمیشہ اپنے تجربے اور وجدان کی پیروی کرتے ہوئے زندگی سے متعلق دنیا کا ایک مکمل تصور پیش کرتا ہے۔ اور ہمیں آرٹ کی اس دنیا کو آرٹ ہی کے حوالے سے دیکھنا چاہئے بالخصوص تنقید کو اپنے تمام معیارات اور اقدار آرٹ کی اسی دنیا کے اندر سے اخذ کرنی چاہئیں اور وہ بھی آرٹ کی جدلیات سے یعنی آرٹ کے تصور اسلوب' ٹیکنیک' ہیئت' زبان وبیان اور اظہار و لفظیات کے بدلتے اور باہم متضاد اور متصادم تصورات سے۔ اس میں سب سے زیادہ گت' جو برصغیر پاک وہند کے اردو ادب میں بنی' وہ مارکس یا مارکسزم کی تھی (بے چارہ مارکس) ادب کے حوالے سے ان سے وہ تک کہلوایا گیا جو

انہوں نے کبھی نہیں کہا۔ اور وہ کچھ چاہا گیا جو خود کبھی نہیں چاہتے تھے۔ یونانی ادب' شیکسپئیر' بالزاک اور بالزاک کی تخلیقات سے مسرت وانبساط حاصل کرنے والے کے ساتھ اس سے بڑی زیادتی اور کیا ہو سکتی تھی۔

اس لئے ۷۷ کے بعد تخلیقی دنیا میں قدم رکھنے والوں کے لئے یہ بڑا مسئلہ تھا کہ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندی کے روایتی ادبی تصور کو قبول کرے' اسلوب ٹیکنیک' زبان وبیان اظہار اور لفظیات کی سطح پر ان کی (بزرگوں کی) پیروی کرے۔ اور ادبی سطح پر اظہار' زبان وبیان اسلوب وٹیکنیک کے ہر تجربے کو رجعت پسندانہ کہے' یہ انحراف یا انکار اس سے پہلی والی نسل کے ہاں بھی نظر آتا ہے لیکن چند ایک کے یہاں ۷۷ کے بعد کی نسل کے نزدیک' ادب میں ترقی پسندی کوئی خارجی چیز نہیں ہے بلکہ وہ تخلیق کی داخلی ساخت اور فن کا حصہ ہے۔

دوسری یہ کہ ترقی پسندوں کی ۳۶ کی نسل سے لے کر اس نسل تک جو ۷۷ تک اپنی شناخت بنا چکی تھی موضوع' زبان وبیان' اظہار' لفظیات وآہنگ اور اسلوب کا ایسا مروجہ ڈھرا بن چکا تھا جس نے ایک مردہ روایت اور کلیشے کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اور اس ڈھرے کے اندر نئی سے نئی بات اور نئے سے نیا خیال بھی پامال فرسودہ اور بے جان ہو جاتا تھا۔ ان میں سب سے خطرناک بات روایتی ترقی پسند شاعری کی بلند آہنگی' رجائیت اور وضاحت تھی۔ اس سے بچنے کے لئے اس نسل نے "زیر لبی" بعض جگہ خود کلامی کا سہارا لیا۔ اور وضاحت کی بجائے استعاروں اور علامتوں سے کام لیا۔ اس لئے اس نسل کی شاعری میں اپنے معاشرے میں موجود ناانصافی اور ظلم کے خلاف احتجاج کے باوجود بلند آہنگی کا شور نہیں ہے گو کہ ان کے ہاں غصہ اور فرسٹیشن زیادہ ہے۔ یہ ساری معاشرتی صورت حال ان کے باطن کا ایک حصہ بن کے داخلی تجربے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے بعض جگہ اس کی شکل انتہائی انفرادی ہو جاتی ہے۔ اس نسل نے جس طرح اس ناقابل قبول صورت حال کو اپنی روح پر جھیلا ہے۔ وہ معاشرتی اور اجتماعی ہونے کے باوجود اس کی شخصی' انفرادی وجودی کرب کی صورت میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ جس کے لئے اس نے بعض استعاروں اور علامتوں کو مخصوص تلازمات کے ساتھ برتا ہے خواہ وہ نظم ہو یا غزل۔ غزل میں اس کی ایک شکل ردیف کے خاص چناؤ اور برتاؤ کی ہے۔

میرے یہاں بھی غزلوں میں کہیں کہیں یہ بات نظر آئے گی۔ ان غزلوں کو محض ردیف

کے حوالے سے اردو غزل کے روایتی اور کلاسیکی تنقیدی معیارات کے تحت دیکھنا زیادتی ہوگی۔ جس میں گفتگو کی تان ایسے جملوں پر ٹوٹتی ہے واہ سبحان اللہ کیا خوب صورت ردیف ہے یا ردیف کو کس خوبی کے ساتھ نبھایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان ردیفوں میں پورے تجربے یا احساس کو منتقل کرنے یا گرفت میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں بیشتر کی حیثیت استعاراتی ہے۔ ان غزلوں میں ردیف کے اس طرح برتنے کا مقصد محض لکھنؤی استادی یا کرافٹس میں شپ دکھانا نہیں ہے بلکہ داخلی اور روحانی کرب کا اظہار اس سطح پر کرنا ہے جس میں غزل اور نظم کو قریب لایا جاسکے۔

اپنی نظموں کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ سیاہ فام بلوچ ہونے اور لیاری میں رہنے کی وجہ سے میرے بہت سے تجربے اردو کے دوسرے شاعروں سے مختلف تھے اور ہیں آدم کے بیٹے' بدصورتی کا حسن اور احتجاج سیاہ فام کے حوالے سے لکھی گئی نظمیں ہیں۔ جنہیں باسانی Negritude کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ محض اس رجحان کے تحت فیشن کے طور پر لکھی گئی نظمیں نہیں ہیں۔ میرے ذاتی تجربے ہیں اردو میں میں نے اس موضوع کے حوالے سے ذاتی سطح کی نظمیں نہیں دیکھی ہیں۔ کیوں کہ یہ اردو میں لکھنے والوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس لئے مجھے نہیں معلوم ان نظموں کو کیسے دیکھا جائے گا! "ٹنڈو آدم کا مسئلہ" کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے کہ یہ ایک پچھڑے ہوئے سماج کی حقیقی صورت حال اور اس کے دانشوروں کے جدید تر فلسفیانہ وسیاسی دانشورانہ خیالات وتصورات کے درمیان جو تضاد ہے' اس سے متعلق ہے۔

ممکن ہے بعض قارئین کو اس کتاب میں چند ایک ایسی نظمیں غزلیں نظر نہ آئیں جن کی وہ توقع رکھے ہوئے ہوں۔ یہ ایک مجبوری ہے اس لئے کہ تمام مواد کو اس ایک کتاب میں نہیں کھپایا جاسکتا تھا۔

میں اپنے ان تمام بزرگوں اور احباب' خواتین وحضرات کا شکر گذار ہوں جنہوں نے کسی بھی سطح پر اس کتاب کی تیاری میں میری مدد کی ہے بالخصوص اپنے محترم استاد ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا جنہوں نے زمانہ طالب علمی سے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور میری ہمت بندھی کہ میں یہ کتاب آپ کے سامنے پیش کرسکوں۔ اپنی شریک حیات تزئین کا جنہوں نے اس معاملے میں میرے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ رکھتا ہے۔ اس کی تیز اور نوکیلی تنقید بلکہ نکتہ چینی کے بغیر میرے لئے

متحرک و فعال رہنا بہت ہی مشکل تھا۔

محترمہ شاہین اختر محترمہ پروین راؤ، محترم توصیف احمد خان، ناصر عباس، شکیل الدین شکیل، غلام مصطفیٰ نیازی، ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری، ظفر جاوید اعجاز، عبدالغفور بلوچ، رمضان بامری سلیمان ذی محمد اور نور بلوچ خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی مدد اور مشورے کے بغیر میرے بہت سے کام نہیں ہو پاتے۔

محترم آصف فرخی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اور نہ میں شکریہ ادا کر کے اس احساس کو کم کرنا چاہتا ہوں جو میرے دل میں ان کے لئے ہے یہ کتاب صرف ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی محنت اور دلچسپی اگر شامل نہ ہوتی تو شاید اس کتاب کی اشاعت اس وقت بھی ممکن نہ ہوتی۔

وہ میرے پیچھے یوں پڑے رہے جیسے میں ان کا پرانا مقروض ہوں، ورنہ "کجا عاشق کجا کالج کی بکواس" انہوں نے مجھے اس طرح گھیرا کہ میں اپنی تمام تر کاہلی اور غیر زمہ داریوں کے کچھ نہیں کر سکا۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ کمپوز کرانے کے بعد انہوں نے مجھے اس کی اطلاع دی اور باقی چیزوں کا مطالبہ کیا۔ اور مجھے ادھر ادھر سے چیزیں ڈھونڈ کر ایک جگہ جمع کرنی پڑیں۔

اب جو بھی ہے جیسا بھی آپ کے سامنے ہے۔ میرا کام ختم ہو گیا ہے۔

ن۔ م۔ دانش

شعبہ اردو

اردو کالج کراچی

یکم جنوری ۱۹۹۷ء۔

۱

کسی کے ساتھ تمہیں دیکھ کر ملال ہوا
عجیب خواب سا دیکھا عجیب حال ہوا

غزل

اک جنگل ہے اس جنگل میں ناچ رہے ہیں بچے تتلی پھول
اک منظر ہے جس منظر میں قید ہوئے ہیں بچے تتلی پھول

اک عالم ہے جیسے آنکھ میں جلتی بجھتی خوابوں کی قندیل
اک وحشت ہے جیسے سارے نقش مٹے ہیں بچے تتلی پھول

اک خاموشی جیسے روح کے سناٹے میں جلتی دھوپ کا راج
اک ویرانی جیسے سب معدوم ہوئے ہیں بچے تتلی پھول

اک دریا وہ جس دریا کی لہروں سے تھی خوشیوں کی تقسیم
اک دریا یہ جس میں سارے ڈوب گئے ہیں بچے تتلی پھول

اک تنہائی جیسے رات کی بانہوں میں ہو ہنگامے کی لاش
اک تاریکی جیسے سارے دیپ بجھے ہیں بچے تتلی پھول

اک محرومی جیسے ہارے لشکر کا ہو تنہا ایک سوار
اک سناٹا جیسے سارے قتل ہوئے ہیں بچے تتلی پھول

ہم سے دانش کونسا ایسا جرم ہوا تھا جس کا دیا خراج
قاتل گھر کی ساری پونجی چھین گئے ہیں بچے تتلی پھول

غزل

لوگ سہمے ہوئے اک عجب بے کلی آسماں زرد ہے
جانے کیا ہو یہ کل دیکھئے گا ابھی آسماں زرد ہے

سرخ پھولوں کی خواہش میں تھک ہار کے اپنی جاں وار کے
لوٹ آئے ہیں زخمی پرندے سبھی آسماں زرد ہے

دل کے پاتال میں اک سیہ رات کا قبضہ جاوداں
سر پہ سورج کی خوابیدہ کھڑکی کھلی آسماں زرد ہے

رات کی گود میں ماہتاب جہاں کی سڑی لاش ہے
دن کی بانہوں میں مردہ سیاہ روشنی آسماں زرد ہے

چاند کے پاؤں میں خواب کی بیڑیاں چھنچھناتی ہوئی
سرد آنکھوں میں کالی گھنی چاندنی آسماں زرد ہے

اپنے خون اور خوابوں کے رنگوں سے غم کی سیاہ رات میں
دل کی دیوار پر ہم بھی لکھتے کبھی آسماں زرد ہے

ایک زنجیر سی خواب اور خاک کی اس کے پاؤں میں تھی
آسماں دیکھ کے رو پڑا اجنبی آسماں زرد ہے

غزل

بس اک دھندلکے کا سماں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں
کیا ہے یہاں سب رائیگاں؟ نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

آواز آئی "ہے کوئی" کوئی نہیں کچھ بھی نہیں
نہ یہ زمیں نہ آسماں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

اک آدمی بیٹھا ہے بس چھپ کر کہیں دیوار پر
خالی ہے یہ سارا مکاں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

اب دوسرا رستہ نہیں اب کوئی بھی منظر نہیں
بس ایک خالی کا سماں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

کوئی نہیں ہے دار پر سونی پڑی ہے رہ گذر
ویران ہیں سب کھڑکیاں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

معدومیت کا جمگھٹا، سایا نہ سائے کا پتہ
کس سے کوئی پوچھے نشاں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

اک درد ہے پھیلا ہوا اک آگ ہے دبکی ہوئی
حد گماں تک ہے دھواں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

۵

اک خوف ہے حدِ نظر اک وہم سا سایا فگن
دکھ کارواں در کارواں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

میں سوچتا ہوں کچھ نہیں، میں دیکھتا ہوں کچھ نہیں
ہے اک عجب سیل رواں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

اب روئیے کیوں شور ہے، اب چیخئے کیوں زور سے
بولو یہاں کیا ہے یہاں نہ وقت نہ لوگ ہیں

ہاں اتنے سالوں بعد بھی میں بھی وہی وہ بھی وہی
ہاں اس کے میرے درمیاں نہ وقت ہے نہ لوگ ہیں

غزل

نشاط و رنج و غم کی ہر کہانی یاد رکھتا ہوں
میں دل کی داستاں صدیوں پرانی یاد رکھتا ہوں

مرے رستے میں دیواریں ہیں آوازیں ہیں چہرے ہیں
میں سب کچھ بھول جاتا ہوں نشانی یاد رکھتا ہوں

کوئی منظر کسی مٹھی میں رکتا ہی نہیں لیکن
میں ہر منظر میں اک رنج روانی یاد رکھتا ہوں

غلط کردیتا ہوں اکثر میں سب کچھ ٹھیک کرنے میں
بھلا دینے کی کوشش میں کہانی یاد رکھتا ہوں

گزرتے بادلوں کا شور ہو کہ گھر کا سناٹا
زمیں کا غم، بلائے آسمانی یاد رکھتا ہوں

ہنسی کی گود میں پوشیدہ آنسو دیکھ لیتا ہوں
میں جینے میں بھی مرگ ناگہانی یاد رکھتا ہوں

بھلا دیتا ہوں اکثر دوستوں کو اپنی نفرت میں
مگر میں دشمنوں کی مہربانی یاد رکھتا ہوں

۷

ہر ایک خاموش شے دنیا کی مجھ سے بات کرتی ہے
میں چیزوں کی یہ گہری بے زبانی یاد رکھتا ہوں

وہ خالی آسماں ہو خالی کمرہ ہو کہ خالی دل
میں ہر اک رنج کو اس کی زبانی یاد رکھتا ہوں

کوئی سرگوشیاں کرتا ہے آدھی رات کو دانش
میں دن کے شور میں شب کی کہانی یاد رکھتا ہوں

غزل

خیال و خواب میں ہونا صدائے باد میں رہنا
کسی کی آس میں جینا کسی کی یاد میں رہنا

پُراسراری عجب سی ہے تیری ویران آنکھوں میں
تجھے بھی راس آیا خانہ برباد میں رہنا

محبت ایک بحر بے کراں ہے اور محبت میں
کہیں پر قید ہونا ہے دل آزاد میں رہنا

کسی کی یاد ہے الجھی ہوئی سانسوں کی ڈوری سے
کسی کے ہجر میں ہے عرصہ فریاد میں رہنا

تو پھر ہجرو وصال ورنج وغم سارے اضافی ہیں
جو حاصل ہے وفا کو عشق کی بنیاد میں رہنا

جفا کی ایک سی رسمیں ہی انساں کا مقدر ہیں
کسی کوفہ میں جینا ہو یا کہ بغداد میں رہنا

کسی سے کیا شکایت' زندگی کو راس آیا ہے
جفا کے شہر میں' دشت ستم ایجاد میں رہنا

غزل

جہاں وہم و گماں ہو جائے گا کیا
یہاں سب کچھ دھواں ہو جائے گا کیا

ستارے، دھول اور مٹی بنیں گے
سمندر، آسماں ہو جائے گا کیا

تمہارا عشق تو لاحاصلی ہے
یہ غم بھی رائیگاں ہو جائے گا کیا

یوں سر پہ ہاتھ رکھ کر چل رہے ہو
تو اس سے سائباں ہو جائے گا کیا

یہ میرا اختتامِ زندگی بھی
کہیں پہ درمیاں ہو جائے گا کیا

کسی کا دکھ سمجھتا ہی نہیں جو
زمانہ مہرباں ہو جائے گا کیا

بہت کچھ ہے یہاں کہنے کے لائق
مگر سب کچھ بیاں ہو جائے گا کیا

ہاں آدم کی نشانی ہے یہ انساں
مگر یہ بے نشاں ہو جائے گا کیا

مجھے مرنا تو ہے اک روز دانش
مگر یہ ناگہاں ہو جائے گا کیا

غزل

دل کو تیرے دھیان میں رکھا
شور سونے مکان میں رکھا

ہر طرف آئینے بچھائے اور
ایک چہرہ جہان میں رکھا

ایک آنسو چھپایا مٹھی میں
اک سمندر مکان میں رکھا

اک محبت جگائی سینے میں
آگ کو خاکدان میں رکھا

جان رکھی تمہاری چوکھٹ پر
دل کو تیری امان میں رکھا

دھوپ پھیلی ہوئی تھی آنکھوں میں
خواب کو سائبان میں رکھا

پاؤں کی بے ثبات وحشت کو
گردش آسمان میں رکھا

خاک ہونے تلک مرے دل نے
مجھکو وہم و گمان میں رکھا

غزل

گھرے تھے ابر کھل کر، پھول جیسے
کھڑے تھے لوگ چھت پر پھول جیسے

یہ کیسے موسموں کا ہے تسلط
اجڑ جاتے ہیں منظر پھول جیسے

تھا وہ شہر نگاراں روشنی کا
مکیں خوشبو کے تھے گھر پھول جیسے

وہاں اب کوئی بھی رہتا نہیں ہے
جہاں تھے لوگ اکثر پھول جیسے

پرانی راکھ اڑتی پھر رہی ہے
مٹے بام و چھت و در پھول جیسے

لئے تعبیر کی حسرت جلو میں
جلے ہیں خواب شب بھر پھول جیسے

یہ دھرتی سرخ پھولوں سے بنی ہے
سجے ہیں دار پہ سر پھول جیسے

دروازے کے باہر

وقت ہے باہر کھڑا
یہ کسے معلوم ہے دروازہ کھولیں
کیا ہمارا منتظر ہو

کونسا دکھ ،کونسی راحت
نصابوں میں لکھی سچائی
یا آنکھوں سے گرتا اشک
تاریکی کھڑی ہو
یا کسی ٹہنی کا تنہا پھول

آنکھیں ---- سرد گہری
جن میں کچھ کھلتا نہ ہو کہ کیا ہے پوشیدہ
نمایاں کیا ہے
کس کا عکس ہے
کیسی شبیہہ ہے
یہ سمندر ہے سراب
پھول ہے کہ دھول ہے
معدومیت یا زندگی
کچھ بھی نہ کھلتا ہو
فقط آنکھیں ہوں گہری منتظر اور اک خلا

آہٹ، کسی قدموں کی
اور کوئی نہیں ہو راہرو
یا پھر لہو ہو
آنکھ سے بہتا لہو
بچوں کا
دل کا
سائبانوں کا لہو
زخمی رداؤں
نوجوانوں
رات دن کا
یا کسی کی احتجاجی چیخ کا
چپ کا
کسی کے خواب کا
یا پھول کا۔

مسکراہٹ ہو، کسی لب کو ترستی
یا کہ پھر تازہ ہوا ہو
یا سنہری دھوپ
محبوبہ ہو
کوئی دوست
یا پھر موت۔

ہم میں کسے معلوم ہے دروازہ کھولیں
کیا ہمارا منتظر ہو۔

آدمی کو کتنا جینا چاہئے

آدمی کو کتنا جینا چاہیے
دو برس دو سو برس یا چند سال

بات اگر جینے کی ہے
وہ بھی خالی ہاتھ خالی دل
خوابوں کے بغیر
تو ہزاروں سال کا جینا ہو کہ لمحوں میں مرنا
ایک سا

ہاں اگر ہاتھوں میں تارے
دل میں امیدیں ہیں
اور آنکھوں میں خواب۔

تو پھر اک پل کا بھی جینا ہے امر
ایک دن صدیوں برابر
ایک اک لمحے کی اپنی زندگی ہے

اور ہر اک لمحے میں پوشیدہ
ایسی ان گنت دنیائیں
جن میں سانس لینے والے پاگل جانتے ہیں
سانس کی قیمت ہے کیا

زندگی کرنا کسے کہتے ہیں
اور مرنا ہے کیا
جرم کیا ہے
چیخ اور انکار کے معنی ہیں کیا۔

کتا بھونکتا ہے

پرانے شہر کی ویراں گلی میں
جب بھی آدھی رات ہوتی ہے
تو کتا بھونکتا ہے

کتا بھونکتا ہے
ایک سایا سا ابھرتا ہے
میرے کمرے کے ویراں طاق پر رکھے
دیئے کی لو لرزتی ہے
سڑک کے اک سرے سے اجنبی سی چاپ ابھرتی ہے
اداسی گھر کے دروازے پر آ کر
بین کرتی ہے
اور کتا بھونکتا ہے

کتا بھونکتا ہے
نیم شب کو دشمنوں کی فوج کی یلغار سے
شہزادیاں سب
سر برہنہ بھاگتی ہیں
اور راجہ قتل ہوتا ہے
فصیل شہر پہ سر کاٹ کر لٹکائے جاتے ہیں
نیا فرمان جاری ہوتا ہے
اور اطاعت کے لئے سب لوگ جھکتے ہیں

زمیں پر
آسماں سے اک ستارہ ٹوٹ گرتا ہے

ہوا فریاد کرتی ہے
درختوں میں عجب سرگوشیاں سی ہونے لگتی ہیں
میرے کمرے کے ویراں طاق پہ رکھے
دیئے کی لو لرزتی ہے
اور اژدہا نکل کر، فاختہ کی نرم گردن سے
لپٹتا ہے

روایت ہے ہمارے شہر کی
جب بھی مصیبت آتی ہے
تو نیم شب کو اذانیں گونجتی ہیں
(لوگ جانیں شہر پہ کوئی قیامت آئی ہے)

اس شب
غنیم شہر کے آگے
اطاعت کے لئے سب لوگ جھکتے ہیں
اذاں کوئی نہیں دیتا
پرانے شہر کی ویراں گلی میں
ایک کتا بھونکتا ہے

آنکھوں سے اوجھل دنیا کے لئے ایک نظم

ہمیں کیا پتہ ہے
یہ ممکن ہے پھول اور پتھر
ہوا، روشنی
ریت، پانی
یہ دریا، پہاڑ اور صحرا کا آپس میں رشتہ ہو
پتھر کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہو
پانی بھی زندہ ہو
آئینے دراصل انسان ہو
چاند تاروں میں صدیوں کی اک دشمنی ہو

ہمیں کیا پتہ ہے
یہ ممکن ہے
آپس میں وہ باتیں کرتے ہوں
روتے ہوں
ہنستے ہوں
الفت، محبت ہو
رنجش ہوں، جھگڑے
کوئی ان میں شیریں
کوئی ان میں لیلیٰ ہو
ان میں بھی قصے، کہاوت،
محبت، شجاعت کی رسمیں ہوں

وہ بھی جدائی کے صدمے
ہماری طرح جھیلتے ہوں
ہماری طرح وہ بھی جیتے ہوں
مرتے ہوں
ممکن ہے
سناٹا دراصل آواز ہو
موت ہی زندگی ہو
اور انساں خدا سے بڑا ہو

ہمیں کیا پتہ ہے
یہ ممکن ہے

ٹنڈو آدم کا مسئلہ

فرد، تنہائی، تشکیک، لامعنیت
بورژوا کشمکش
جدلیت، قدریں، اخلاق، معروضیت
معاشرہ، خوف، مذہب سماجی عمل
مادیت حق، سچائی، انصاف، جنگ
سامراجی تسلط
نوآبادیات

کمیونیکیشن
کمٹمنٹ

کلیشے
کرافٹ

صنعتی عہد
مغرب کی بے راہ روی
ماورائے حقیقت صداقت
ہمہ اوست
مشرق کی بے چارگی
لفظ و معنی کا رشتہ ہے کھلتا نہیں۔۔۔

کرکیگرڈ ابن عربی بغل گیر ہیں

سارتر سر بزانو پریشان ہے
ایلیٹ دل گرفتہ کہاں آ گیا
مارکس اینگلس خود اپنے کئے پہ پشیمان ہیں
ٹنڈو آدم کا مسئلہ عجب ہے
کہ سب پوچھتے ہیں اب اک دوسرے سے
کہ چشموں کے شیشوں پہ یہ دھند کیسی ہے
چیزیں مکمل نظر کیوں نہیں آتی ہیں
روشنی میں اندھیرا اتارا ہے کس نے
دلوں میں یہ کیوں برف سی جم رہی ہے

لہو سرد کیوں ہے
یہ چلاتی سڑکوں پر
ویران گلیوں
اور روتے مکانوں میں سناٹا کیسا ہے
آواز کے پھول مرجھائے کیوں ہیں
دریچے کھلے ہیں
ہوا ہے
مگر حبس کیسا ہے
مرنے سے پہلے یہ کتبے گھروں پہ سجائے ہیں کس نے
یہ بے معنی اور کھوکھلی سی ہنسی کس لئے ہے
خدا نے جانے یہ سارے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے
کوئی سوچتا بھی نہیں ہے

غزل

اجاڑ آنکھوں میں رت جگوں کا عذاب اترا ہے نیم شب کو
جو درد جاگا ہے شام ڈھلتے تو شعر لکھا ہے نیم شب کو

میں خالی کمرے کے سرد گوشے میں روز تنہا' یہ سوچتا ہوں
یہ کون ہنستا ہے دن ڈھلے تک یہ کون روتا ہے نیم شب کو

ہمارے بچوں کی سبز آنکھوں میں روشنی کے کنول نہیں ہیں
اداس سایا سا روز آکر یہ مجھ سے کہتا ہے نیم شب کو

دعائیں لے کر ہم اپنے ہونٹوں پہ جانے کس سکھ کے منتظر ہیں
ہمیں خبر ہے کہ اس نگر پہ عذاب اترا ہے نیم شب کو

دہکتے سورج کا ظلم کچے گھروں کے باسی ہی جھیلتے ہیں
یہ بات سوچی نہیں تھی دن میں جو خواب دیکھا ہے نیم شب کو

کسے خبر ہے یہ کونسی شے وجود شمع کو چاٹتی ہے
یہ دیکھتے ہیں کہ ایک سایا لرزتا رہتا ہے نیم شب کو

تمہاری یادوں کی دھیمی لے ہے یا میں ہوں یا پھر کوئی نہیں ہے
تو سونے آنگن میں کون آکر دیا جلاتا ہے نیم شب کو

یہ آگہی کے اداس لمحوں میں کرب کیا ہے، عذاب کیا ہے
وہ جانتا ہے جو اپنے رب کی طرح سے تنہا ہے نیم شب کو

تم اپنے سارے گذشتہ لمحے بھلا ہی دینا مگر یہ کرنا
اسے دعاؤں میں یاد رکھنا جو تم کو روتا ہے نیم شب کو

اگر کبھی تم ملو گے اس سے یہ جان لو نون میم دانش
وہ آدمی ہے جو درد پاتا ہے خواب بوتا ہے نیم شب کو

غزل

وہ دور خوابوں کے ساحلوں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے
یہ کون جانے کہ اب رتوں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے

یہ کون جانے کہ کس کا چہرہ غبار لمحوں میں خاک ہوگا
یہ کون جانے کہ اب دنوں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے

یہ زرد چہرے کی ساری زردی یہ بانجھ آنکھوں کا رتجگا پن
یہ پوچھتے ہیں کہ آئینوں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے

جبیں پہ ابھری ہوئی شکن میں یہ کس کی یادوں کا عکس غم ہے
یہ وقت کے بہتے دائروں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے

یہ دھوپ چھاؤں پہ خار کلیاں یہ ساحلوں کی ہوا کی خوشبو
یہ استعاروں علامتوں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے

یہ کون جانے کہ کرب کیا ہے اداس لہجے میں درد کیا ہے
یہ کون جانے کہ اب دلوں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے

تمام خلقت دکھوں کی تختی گلے میں لے کر کھڑی ہوئی ہے
جو روز ہوتے ہیں سانحوں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے

یہ جرم گندم ہمارا ورثہ سہی مگر یہ حیات دانش
جو کاٹتے ہیں ہم ان دکھوں میں عذاب کس کے ہیں خواب کس کے

غزل

یہ کیا رت ہے اب کی رت میں دیکھیں زرد گلاب
چہرے سوکھے پھول خزاں کے آنکھیں زرد گلاب

پھول سے بچے بھی خوابوں کے ایندھن بنتے جائیں
دیکھیں کیسی رت پھولوں کی اوڑھیں زرد گلاب

ایک علامت ہوگئی اپنے خوابوں کی تفسیر
سوچیں اپنے خوابوں کو تو لکھیں زرد گلاب

دیواروں پر اپنی نسل کا نوحہ لکھتے جائیں
جس کے دن بھی زہریلے ہیں راتیں زرد گلاب

جھوٹ کے زہریلے پنجوں میں جکڑے مردہ لوگ
باتیں اڑتی خوشبو جیسی، سوچیں زرد گلاب

اب آنگن میں سناٹے کی ڈائن ناچ گائے
اب بچوں کے بدلے گھر میں کھیلیں زرد گلاب

آنے والے شاید اپنے دکھ کو سمجھیں گے
دانش یار کتابوں میں ہم رکھیں زرد گلاب

مجھے اڑتے پرندے اچھے لگتے ہیں

مجھے اڑتے پرندے اچھے لگتے ہیں
شرارت سے کبھی یہ آسماں کو چھو کر آتے ہیں
کبھی بادل میں چھپتے ہیں
ستاروں کے شناسا
چاند سے ان کی رفاقت ہے
یہ نامعلوم اور ان دیکھی دنیاؤں کے واقف
ہم سے زیادہ جانتے ہیں
آسماں کے بارے میں
وسعت کے بارے میں
مجھے اڑتے پرندے اچھے لگتے ہیں

فضا کی بے کراں وسعت میں
یہ اڑتے پرندے رقص کرتے ہیں
تو لگتا ہے کہ جیسے زندگی کا حسن
ان کے بازوؤں
ان کے پروں میں قید ہے

یہ اڑتے ہیں
نہ زنجیر گراں ہے کوئی پاؤں میں
نہ گردن میں کوئی طوق غلامی ہے
کہ جو انسان کی خودداری یہ

انسانیت پہ
ضرب کاری
ایک لعنت ہے

یہ اڑتے ہیں
فضا میں حسن کی تصویر بنتی ہے
عجب تحریر بنتی ہے
کہ جس میں خواب میرے ہیں
یہ خواب آزادی کے
وسعت،
فراز زندگی کے
زندگی کے حسن کے ہیں۔

اور آزادی
جو وسعت ہے
فراز زندگی ہے
حسن ہے
جو پرندوں کے پروں میں سانس لیتی ہے
مجھے اڑتے پرندے اچھے لگتے ہیں

غزل

دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گزر گئے
اس دل کی بے بسی کو بہت دن گزر گئے

ہر شب چھتوں پہ چاند اترتا تو ہے مگر
اس گھر میں چاندنی کو بہت دن گزر گئے

کوئی جواز ڈھونڈ غم ناشناس کا
بے وجہ، بے کلی کو بہت دن گزر گئے

اب تک اکیلے پن کا مسلسل عذاب ہے
دنیا سے دوستی کو بہت دن گزر گئے

تیری رفاقتیں تو مقدر میں ہی نہ تھیں
اب اپنی ہی کمی کو بہت دن گزر گئے

مدت ہوئی ہے ٹوٹ کے رویا نہیں ہوں میں
اس چین کی گھڑی کو بہت دن گزر گئے

وہ جاگتی حویلی بھی ویران ہو گئی
اس نقرئی ہنسی کو بہت دن گزر گئے

وہ قہقہے بھی وقت کے صحرا میں کھو گئے
گلیوں کی خامشی کو بہت دن گزر گئے

مدت ہوئی کہ رات کا وہ جاگنا گیا
اس رنج عاشقی کو بہت دن گزر گئے

جو اعتبار زخم ہنر نے عطا کیا
دانش وہ شاعری کو بہت دن گزر گئے

غزل

وہ دیپ آنکھوں میں جل بجھا ہو تو خواب کیسے
زہر دلوں میں اتر گیا ہو تو خواب کیسے

میں اپنے ہاتھوں میں چاہتوں کی لکیر ڈھونڈوں
نصیب ہاتھوں سے مٹ گیا ہو تو خواب کیسے

یہ زندگی ہے تمہارے خوابوں کے نام لیکن
تمہاری یادوں میں جاگنا ہو تو خواب کیسے

اداس راتوں کی راکھ دل میں بکھر گئی ہے
اجاڑ آنکھوں میں رتجگا ہو تو خواب کیسے

یہ زندگی دربدر ہوئی کس کی جستجو میں
جہاں، مسافت کا سلسلہ ہو تو خواب کیسے

گمان کیسے نہیں تھے لیکن رہ وفا میں
حقیقتوں کا ہی سامنا ہو تو خواب کیسے

جو سچ ہمارے گھروں کو ویران کر گیا ہے
اسی کو خوابوں میں دیکھنا ہو تو خواب کیسے

غزل

سب کچھ مان لیا کرتے تھے بچپن میں
کتنے شاد رہا کرتے تھے بچپن میں

چھوٹی چھوٹی باتوں پہ رو لیتے تھے،
دکھ میں جھوم لیا کرتے تھے بچپن میں

وہ دنیا اب کس دنیا میں بستی ہے
جس کو روز سنا کرتے تھے بچپن میں

پت جھڑ جن کو چھونے سے بھی ڈرتا تھا
ایسے پھول کھلا کرتے تھے بچپن میں

تلخی بن کر باتوں میں در آیا ہے
ہم جو زہر پیا کرتے تھے بچپن میں

اب تو بس تاوان دیئے ہم جاتے ہیں
کل جو سانس لیا کرتے تھے بچپن میں

غزل

تجھ سے بچھڑ کے کیا کہیں دل کا یہ حال اور ہے
رنج فراق اور ہے رنگ ملال اور ہے

کس طرح متفق ہوں ہم سادہ کسی بیان پر؟
دل کا ارادہ اور ہے اس کا خیال اور ہے

کیسے سمجھ سکا کوئی دل کے معاملات کو
دل کی زبان اور ہے صورت حال اور ہے

کیسے بیان ہو ترا رنگ ادائے دلبری
حسن ادا کچھ اور ہے رنگ جمال اور ہے

تارے بچھانا خاک پر کونسا ایسا کام ہے
دل کو جو آسماں کرے وہ تو کمال اور ہے

یہ ہی نہیں کہ صرف تو تنہا ہی کر گیا مجھے
اب کے بساط عشق پر وقت کی چال اور ہے

کوئی نہیں ہے جو مجھے اب کے بچائے ہار سے
اے غم شام زندگی اب کے زوال اور ہے

غزل

ن۔م۔ دانش

جانے کن لمحوں کو صدا دی دل میں دھیان کی لہروں نے
بیٹھے بیٹھے آگ لگادی دل میں دھیان کی لہروں نے

مدھم دھندلے چہرے، یادیں دوارے آکر بیٹھ گئے
وقت کی ہر دیوار گرادی دل میں دھیان کی لہروں نے

یاد کی لو پر جلتے رہنا کھیل نہیں تھا، خاک ہوئے
آج وہی پھر خاک اڑا دی دل میں دھیان کی لہروں نے

دن کے ہنگاموں میں کس کو فرصت تھی، جب شام ہوئی
یادوں کی زنجیر ہلادی دل میں دھیان کی لہروں نے

اک بے انت اداسی کی رو درد جگا کر بیٹھ گئی
شام ہوئی اور دھوم مچادی دل میں دھیان کی لہروں نے

اب کوئی کیا خواب بنے کیا لہر اٹھے کیا آگ جلے
دل کی ہر امید مٹادی دل میں دھیان کی لہروں نے

یادوں کے چوپال میں قصے کہتے سنتے رہتے ہیں
رات ہوئی اور آگ جلادی دل میں دھیان کی لہروں نے

غزل

دیا جلایا اپنے آپ سے باتیں کیں خاموشی میں
کوئی نہ آیا اپنے آپ سے باتیں کیں خاموشی میں

آدھی رات کو جب قدموں کی چاپ یہ میرے ساتھ چلی
تو گھبرایا اپنے آپ سے باتیں کیں خاموشی میں

تیرا غم تھا کس سے کہتے میں نے خالی کمرے کو
حال سنایا اپنے آپ سے باتیں کیں خاموشی میں

پچھلی رات کا قصہ ہے کہ صدیوں کا لیکن میں نے
دل بہلایا اپنے آپ سے باتیں کیں خاموشی میں

وہ غصہ تھا یا وحشت تھی لیکن گذری باتوں پر
جب پچھتایا اپنے آپ سے باتیں کیں خاموشی میں

غزل

کوئی پرچھائیں زیرِ آسماں رہنے نہیں دوں گا
کسی کے سر پہ کوئی سائباں رہنے نہیں دوں گا

میں پہلے منہدم کردوں گا ہر شے، ہر تعلق کو
پھر اس کے بعد دھرتی پہ مکاں رہنے نہیں دوں گا

میں اک لا انتہا کی آرزو میں ساری دنیا کو
اسیرِ خواہشِ وہم و گماں رہنے نہیں دوں گا

میں پردے چاک کردوں گا سبھی بے معنی رشتوں کے
کسی کو بھی کسی پہ مہرباں رہنے نہیں دوں گا

تعلق گر نہیں کوئی تو راہ رسم دنیا بھی
میں اپنے اور تمہارے درمیاں رہنے نہیں دوں گا

میں پہلے کھینچ لوں گا پاؤں کے نیچے سے دھرتی کو
پھر اس کے بعد سر پہ آسماں رہنے نہیں دوں گا

غزل

تیرا خیال بہت دیر تک نہیں رہتا
کوئی ملال بہت دیر تک نہیں رہتا

اداس کرتی ہے اکثر تمہاری یاد مجھے
مگر یہ حال بہت دیر تک نہیں رہتا

میں ریزہ ریزہ تو ہوتا ہوں ہر شکست کے بعد
مگر نڈھال بہت دیر تک نہیں رہتا

جواب مل ہی تو جاتا ہے ایک چپ ہی نہ ہو
کوئی سوال بہت دیر تک نہیں رہتا

میں جانتا ہوں کہ سورج ہوں ڈوب جاؤں بھی تو
مجھے زوال بہت دیر تک نہیں رہتا

غزل

اک جان ہے اس جان سے آگے نہیں دیکھا
دل نے ترے پیمان سے آگے نہیں دیکھا

پھولوں کی مہک ہے نہ کسی جسم کی خوشبو
اس شہر نے گلدان سے آگے نہیں دیکھا

دنیا تو بڑی چیز ہے لیکن وہ کرے کیا
جس نے کبھی دالان سے آگے نہیں دیکھا

کہتے ہیں خدا بھی ہے زمانے میں، مگر ہاں
ہم نے کبھی انسان سے آگے نہیں دیکھا

کوئی دوست ہوتا

کوئی دوست ہوتا
یہاں گر نہیں ہے
کسی اجنبی دیس میں ہی سہی --- پر
کوئی دوست ہوتا

کبھی اس کو لکھتے
"کراچی کے موسم میں حدت بہت ہے
اداسی
(جو خود میرے دل کی اداسی ہے)
ہر گھر کے آنگن میں منحوس بانہیں
پھیلائے کھڑی ہے

گھٹائیں تو آتی ہیں
لیکن برستی نہیں ہیں
یوں لگتا ہے جیسے
میرے شہر پہ کوئی آسیب ہے
قحط باراں کا سایا ہے اس پر"

کبھی اس کو لکھتے

"میں تنہا بہت ہوں

وہ لڑکی جو مجھ کو سر راہ'
چلتے ہوئے مل گئی تھی
یونہی راہ چلتے ہوئے کھو گئی ہے
میں اب اس کی یادوں کی دہلیز پہ
سر جھکائے ہوئے منتظر ہوں ۔۔ وہ آئے
مگر جانتا ہوں کہ یہ خواب ہے
جھوٹے خوابوں سے کس کو ملی ہے وصال تمنا"

کبھی اس کو لکھتے

"گھروں سے یہ دوری قیامت ہے لیکن
مگر خود سے کٹ کر بھی جینا
قیامت سے کمتر نہیں ہے
دعا ہے
خدا تم کو خود سے ہمیشہ یوں مربوط رکھے
کبھی خود سے دوری کا دکھ نہ اٹھاؤ

کبھی اس کو لکھتے

"سنا ہے یہ میں نے
جہاں تم ہو اس دیس میں اب
کسی شے کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے
ہر اک شے ہے بے مایہ' بے قیمت
اور سب سے سستی"

کبھی اس کو لکھتے

"کہ اب جنگ کا پھر سے امکان ہے
عالمی طاقتوں کے مفادات
آپس میں ٹکراتے ہیں
اور یہ بھی سنا ہے
کہ اس جنگ میں یہ عمارات سالم رہیں گی
فقط آدمی ختم ہوں گے"

کبھی اس کو لکھتے

"کوئی دوست ہوتا
یہاں گر نہیں ہے
کسی اجنبی دیس میں ہی سہی - پر
کوئی دوست ہوتا"

کبھی اس کو لکھتے

ہر روز ہم اپنے خوابوں کی توہین کریں

ہر روز ہم اپنے خوابوں کی توہین کریں
وہ خواب
جو اپنے پل پل کی اس راکھ سے ہم تعمیر کریں
جب دل میں درد بگولہ بن کر اٹھتا ہے
سینے میں گھر کا سناٹا
آنکھوں میں وحشت بولتی ہے
جب پاؤں میں آوارگی کی زنبیل لئے
ہم دھول اڑاتی بستی میں
تنہا آوارہ پھرتے ہیں

(اور چہروں کے سیلاب میں تجھ کو ڈھونڈتے ہیں)

جب ویراں گھر
زخمی آنگن
ناسور برستے لہجے میں فریاد کریں
جب بجے زرد دوپہروں میں
اک دھوپ کی چادر تان کے سر پر ناچ کریں

ہم ایسی زرد دوپہروں میں
جب دکھ کی راکھ برستی ہے
اس راکھ کو تیری یاد کے زیور پہنا کر

راتوں کو خواب پروتے ہیں
اور دوسری صبح!
وہ خواب انا کی تھال میں رکھ
مجروح پندار کے ہاتھوں
تیرے قدموں پہ ہم ڈالتے ہیں
وہ خواب، جو اپنے پل پل کی اس راکھ سے ہم تعمیر کریں
ہر روز ہم اپنے خوابوں کی توہین کریں

زندگی خواب میں رونما ہونے والا کوئی حادثہ تو نہیں

زندگی خواب میں رونما ہونے والا کوئی
حادثہ تو نہیں ہے
کہ جس کے "نہ ہونے" اور "ہونے" کا احساس بھی
صبح کی دھوپ میں کُھلا جائے

پھر اس کے "ہونے" کی کوئی اذیت
نہ اس کے "نہ ہونے" کا دکھ

اپنے چہرے کی گہری لکیروں میں
اک تجربے کا نشاں بن کے زندہ رہے

زندگی خواب میں رونما ہونے والا
کوئی حادثہ تو نہیں ہے

جو سوچو تو ہے
اور نہ سوچو نہیں ہے

زندگی آئینہ ہے
کہ جیسے ہی ہم کو
کوئی لمحہ چھو کے گزر جاتا ہے
لمس کی گہری حدت سے

وہ لمحہ
چہرے پر اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے

لمحے گزرتے ہیں
چہرے پہ بھی لمس کے یہ نشاں بڑھتے جاتے ہیں
اک وقت آتا ہے
وہ سارے لمحے
(جو دراصل سب سانحے ہیں
جو ہم پر گذرتے ہیں)

آئینے پہ نقش ہو جاتے ہیں
اور آئینے میں
جھریوں کے سوا
کچھ نظر تک بھی آتا نہیں

زندگی خواب میں رونما ہونے والا کوئی
حادثہ تو نہیں ہے
کہ جس کے "نہ ہونے" اور "ہونے" کا احساس بھی
صبح تک نہ رہے۔

غزل

جنہیں ہم کہہ نہیں پائے وہ باتیں یاد آتی ہیں
گذشتہ نا ملاقاتوں کی یادیں یاد آتی ہیں

کبھی ویران رستوں پر کبھی تنہائی کی چپ میں
وہ چہرہ بات کرتا ہے وہ آنکھیں یاد آتی ہیں

کبھی آئے نہیں وہ دن جو اکثر ساتھ چلتے ہیں
گزاری جو نہیں ہم نے وہ راتیں یاد آتی ہیں

جہاں رکھا نہیں پاؤں وہ رستہ ساتھ چلتا ہے
جنہیں سوچا نہیں دل نے وہ راہیں یاد آتی ہیں

غزل

یہ دل ہے گم کسی کے انتظار میں کہ خواب میں
چمک رہا ہے یہ دیا غبار میں کہ خواب میں

یہ کھڑکیوں اور آنگنوں میں سرخ زرد پھول ہیں
یہ رنگ ہے حیات کا بہار میں کہ خواب میں

یہ کونسی ہیں منزلیں کہ ہر سفر ہے رائیگاں
بھٹک رہا ہوں میں تیرے دیار میں کہ خواب میں

یہ گھوم پھر کے ایک ہی مقام پر ہے زندگی
اک عمر سے میں قید ہوں حصار میں کہ خواب میں

شکست بھی عجیب تھی وہ خواب بھی عجیب تھا
عذاب کس میں زیادہ تھا اس ہار میں کہ خواب میں

مجھے خبر ہے حسن غم طلسم ہے یہ زندگی
مگر کھلے گا مجھ پہ یہ خمار میں کہ خواب میں

غزل

کبھی یادِ یار بہار میں مجھے دیکھنا
کبھی اپنے غم کے خمار میں مجھے دیکھنا

کسی موج دشت نورد سے مجھے پوچھنا
کبھی رنگ زخم بہار میں مجھے دیکھنا

ہاں اگر مرے خد و خال میں کوئی اور ہے
تو کسی کے نقش و نگار میں مجھے دیکھنا

میں جواب ہوں ترے تشنہ خواب و خیال کا
کبھی اپنے ہار و سنگھار میں مجھے دیکھنا

کبھی ان کہے کسی حرف میں مجھے سوچنا
دل نغمہ و رگ تار میں مجھے دیکھنا

میں اگر کبھی غم زندگی سے نکل گیا
تو پھر اپنے غم کے حصار میں مجھے دیکھنا

کسی رنگ صبح بہار میں میرا عکس ہے
کسی شام غم کی نکھار میں مجھے دیکھنا

مجھے لے چلے جو ہوائے غم تیری یاد کی
تو پھر ریگ دشت و غبار میں مجھے دیکھنا

غزل

ہجر کے موسم تنہائی کے دکھ دیکھے
اک چہرے کے پیچھے کتنے دکھ دیکھے

اک سناٹا پہروں خون رلاتا ہے
اک آواز کی خاطر کیسے دکھ دیکھے

میں بھی اپنی ذات میں تنہا پھرتا ہوں
تم نے بھی بے خواب رتوں کے دکھ دیکھے

جن بچوں نے ہنسنا بھی نہ سیکھا تھا
ان بچوں نے سب سے پہلے دکھ دیکھے

تم کو دیکھا ہے تو یہ محسوس ہوا
کیسے مرجھاتے ہیں چہرے دکھ دیکھے

ہم دونوں نے اک دوجے کو جان لیا
ہم دونوں نے اک دوجے کے دکھ دیکھے

جس کو جینا ہے دنیا میں، دستور ا
لازم ہے وہ سب سے پہلے دکھ دیکھے

اب لوگوں کے چہروں پر یہ لکھا ہے
ان لوگوں نے سکھ کے بدلے دکھ دیکھے

ہم لوگوں کا بچپن کیسا بچپن تھا
ہم لوگوں نے کیسے کیسے دکھ دیکھے

رات گئے تک میں نے اس کی یادوں میں
جیسے شعر لکھے تھے ویسے دکھ دیکھے

دانش کیسا کرب چھپائے پھرتا ہے
شعر کہے، راتوں کو جاگے، دکھ دیکھے

دانش ہم نے جس رت میں جینا سیکھا
وہ رت گزری، سپنے ٹوٹے دکھ دیکھے

غزل

یہ دن یہ رات یہ لمحے مجھے اچھے سے لگتے ہیں
تمہیں سوچوں تو سارے سلسلے اچھے لگتے ہیں

میرے دل میں در و دیوار پر سارے مناظر میں
تم ہی تم ہو مجھے آئینے اچھے سے لگتے ہیں

بہت ہی دور تک چلنا مگر پھر بھی وہیں رہنا
مجھے تم سے تم ہی تک دائرے اچھے سے لگتے ہیں

مجھے دن رات کرلینا ہی بس اچھا نہیں لگتا
خوشی دکھ سکھ یہ سارے مرحلے اچھے سے لگتے ہیں

خفا ہونا ادا سے مسکرانا اور چپ رہنا
مجھے یہ حسن کے سب زاویے اچھے سے لگتے ہیں

خود اپنی ہی شرارت سے کبھی تھک ہار کے بچے
یونہی سر کو جھکائے سوچتے اچھے سے لگتے ہیں

بہت ہی چھوٹی باتوں پر کبھی بے ساختہ دو دل
بہت ہی زور سے ہنستے ہوئے اچھے سے لگتے ہیں

غزل

یہ دل اب بھی خواب جوانی میں ہے
اثر اب تک اس کی کہانی میں ہے

کسی نہ کسی شے میں موجود ہے
وہ خود اپنی چھوڑی نشانی میں ہے

کہاں پر لئے جارہا ہے مجھے
یہ دریا کہ اپنی روانی میں ہے

کہیں ذکر تک اس کا آتا نہیں
جو دراصل ساری کہانی میں ہے

کسی کی کوئی بات سنتا نہیں
وہ گم اپنی رنگیں بیانی میں ہے

ہوا مضطرب بچے خاموش ہیں
عجب درد نقل مکانی میں ہے

کبھی یاد کرنا تو چپ بیٹھنا
سوائے کیا اس کے جوانی میں ہے

تیرا غم مجھے بھولتا ہی نہیں
یہ کیا غم ہے جو زندگانی میں ہے

اداسی یونہی بے سبب تو نہیں
کوئی رنج شام سہانی میں ہے

یہاں جو بھی آئے گا دہرائے گا
کہانی نئی اس کہانی میں ہے

عجب اس کے طور اس کے انداز ہیں
کہ بے مہر بھی مہربانی میں ہے

اگر اس کے لچھن یہی ہیں تو پھر
میں دیکھوں گا وہ کتنے پانی میں ہے

۵۴

کوئی غم نہیں ہے

بہت دن ہوئے ہیں
دنوں کی اداسی
شبوں کی قیامت
رفاقت کی وحشت
جدائی کے صدمے
مسرت کی خواہش
سبھی ایک جیسے

پرانے سے منظر
ان آنکھوں کے در پر
پرانی سی باتیں
شکستہ لبوں پر
وہی رسم داری
وہ چائے کی پیالی
وہی قہقہے ہیں

دلوں کی تہوں میں
وہی تیرگی ہے
وہ خالی سا کمرہ
وہی بے حسی ہے
وہی رات دن ہیں

وہی زندگی ہے
بہت دن ہوئے ہیں
کوئی غم نہیں ہے

دوسرا کنارا

خواب خواب ہوتے ہیں
خواب کے مسافر کو
زندگی کی راہوں میں
بے چراغ راتوں سے
اک چراغ ملتا ہے
اس چراغ کی لو میں
خواہشوں کی تصویریں
رقص کرتی رہتی ہیں
ہاتھ کی لکیروں میں
بے ثبات تحریریں
آنکھ کے جزیرے میں
دل کی ایک دنیا ہے
جس کی بند مٹھی میں
چاہتوں کا ہیرا ہے
درمیان میں دل کے
اک کھلا سمندر ہے
اور اس سمندر کی
سانس لیتی لہروں میں
زندگی کے رشتے ہیں
بے پناہ قربت ہے
لازوال تنہائی!

تم بھی اس سمندر کی
سانس لیتی لہروں میں
اپنے ملنے والوں سے
مسکرا کے ملتی ہو
جادوئی تبسم سے
گل کھلاتی رہتی ہو

میں اسی سمندر کے
دوسرے کنارے پر
دور ہوتی لہروں کو
زخم خوردہ آنکھوں سے
سر جھکائے گنتا ہوں

دور ہوتی لہروں میں
خواب کے مسافر کے
خواب کی تھکن کی لے
گونجتی ہی رہتی ہے

دور ہوتی لہروں کو
اپنے اپنے حلقے میں
ملتے ایک دوجے سے
دیکھتا ہی رہتا ہوں

ایک سلسلہ دل کا
جو کہیں نہیں ملتا
ایک زخم ہے دل کا
جو کبھی نہیں سلتا

سوچتا ہی رہتا ہوں

غزل

کبھی گزرے دنوں کے رنج میں ناشاد ہونے سے
یہ دل برباد ہوتا ہے کبھی آباد ہونے سے

کبھی یہ شام کی وحشت لئے پھرتی ہے سڑکوں پر
کبھی اک موج میں رہتے ہیں ہم آزاد ہونے سے

ہمارے پاس کیا تھا جو اسے غارت کوئی کرتا
تمہارے بعد کیا ہے جو ڈریں برباد ہونے سے

ہمیں بھی ایک دن ان منظروں کے ساتھ جانا ہے
بچائے گا ہمیں بھی کون اک دن یاد ہونے سے

کبھی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں انجانی مسرت سے
کبھی مرجاتے ہیں اک خواب کے برباد ہونے سے

عجب اک رنج ہوتا ہے شب ویران میں اکثر
کسی کو سوچ کے تنہائیوں میں شاد ہونے سے

جو مٹی سے نہیں جڑتے کبھی زندہ نہیں رہتے
تباہ ہوجاتے ہیں وہ لوگ بے بنیاد ہونے سے

غزل

حقیقت خواب جیسی ہے نظارا خواب جیسا ہے
میں جو بھی دیکھتا ہوں وہ تماشا خواب جیسا ہے

بس اک آواز پر اک سمت سارے لوگ جاتے ہیں
نیا یہ روز کا منظر پرانا خواب جیسا ہے

یہاں بس نیند میں چلتے ہوئے تم دیکھتے جاؤ
وہ منزل اک فسانہ ہے، یہ رستہ خواب جیسا ہے

وہ اک سیل رواں ہے حسن کا، کہنے کی باتیں ہیں
وہ آنکھیں پھول جیسی ہیں وہ چہرہ خواب جیسا ہے

تیری گہری رفاقت میں یہی محسوس ہوتا ہے
یہ سورج چھاؤں جیسی ہے یہ سایا خواب جیسا ہے

عجب نادیدہ زنجیریں لئے پھرتے ہیں پاؤں میں
یہ وحشت ایک دھوکہ ہے یہ صحرا خواب جیسا ہے

میں اپنی معنویت کس سے پوچھوں تیری محفل میں
یہ دنیا خواب جیسی ہے یہ ہونا خواب جیسا ہے

میں ہر منظر میں اپنے خون دل سے رنگ بھر دوں گا
ابھی یہ مانتا ہوں میں کہ نقشہ خواب جیسا ہے

کورا برتن

وہ راہ چلتے ہوئے ملی تھی
وہ جس کے چشمے کے موٹے شیشوں پہ ذات کے دکھ کی گرد کی تہہ
جمی ہوئی تھی

وہ جس کے چہرے
وہ جس کے ماتھے پہ اک مسلسل سفر کا نوحہ لکھا ہوا تھا
وہ جس کی آنکھوں میں
رتجگوں کی عذاب دیدہ زہر کی خوشبو رچی ہوئی تھی
وہ جس کی باتوں میں
اس کے اندر کا زرد سناٹا بولتا تھا

وہ ایک لڑکی
جو کورا برتن تھی
جس کا فاتح ہی اس کا مفتوح
وہ کورا برتن
کہ جس کو جینے کا لمس دینے کی اندھی خواہش
ہمیشہ وصل نفی کی صورت میں
اپنے فاتح کو مارتی ہے

وہ ایک لڑکی

وہ ایک لمحے میں، راہ چلتے ہوئے ملی تھی
وہ زندگی کے تمام برسوں تمام سالوں پہ چھا گئی ہے

غزل

گردش ساغر سبو کے درمیاں
زندگی ہے ہاؤ ہو کے درمیاں

زخم اور پوشاک بھی رکھے گئے
آئینہ اور آب جو کے درمیاں

تیرا رستہ کدھر کو جائے ہے
آرزو اور جستجو کے درمیاں

کتنی بے معنی سی ہے یہ زندگی
خاموشی اور گفتگو کے درمیاں

زندگی ترجیح کس کو دیتی ہے
سبز رو اور خوش گلو کے درمیاں

یاد کی اک اجنبی پرچھائیں ہے
رنگ و بو و کاخ و کو کے درمیاں

وقت سے بچ کر نکل جاؤں کہیں
ایک در ہے چار سو کے درمیاں

میرا چہرہ دوسروں سے مختلف
فرق ہے کیا یہ لہو کے درمیاں

غزل

رات درپیش تھی مسافر کو
نیند کیوں آگئی مسافر کو

کیا نگر ہے یہ دل دکھائی دے
ہر طرف آگ سی مسافر کو

کل محبت سرائے حیرت میں
اک ملا اجنبی مسافر کو

یاد کے بے کراں سمندر میں
اک لہر لے چلی مسافر کو

یاد آجائیں خواب جیسے لوگ
جانے کب، کس گھڑی مسافر کو

ساتھ لے کر چلی گئی اپنے
اک پری سانولی مسافر کو

اک صدا تھی کہ ہر گھڑی، ہر پل
جو بلاتی رہی مسافر کو

اک کہانی بہت پرانی سی۔
یاد آتی رہی مسافر کو

چپ لگی جب بھی بھولنے والے
یاد آئے کبھی مسافر کو

دور بس اک چراغ جلتا تھا
وہ عجب رات تھی مسافر کو

موت کا دشت پار کرلیتا
عمر کی قید تھی مسافر کو

لے چلی ہے نئی رفاقت کی
اک نئی روشنی مسافر کو

ایک وحشت میں لے کے پھرتی تھی
رات بھر چاندنی مسافر کو

دیر تک یاد کرکے روتی رہی
ایک لڑکی کسی مسافر کو

کھینچ لاتی ہے اپنی مٹی تک
خاک کی دوستی مسافر کو

غزل

شہر کا راستہ عجیب سا ہے
ہر قدم حادثہ عجیب سا ہے

درمیان من و تو کچھ بھی نہیں
پھر بھی یہ فاصلہ عجیب سا ہے

روز اک خوف میں جئے جانا
روز مرنا بڑا عجیب سا ہے

زخم کو چاٹنا یونہی دن بھر
رات بھر جاگنا عجیب سا ہے

آج کچھ بھی نہیں ہوا ہے یہاں
آج کا واقعہ عجیب سا ہے

جز بھٹکنے کے کوئی کام نہیں
آہ یہ قافلہ عجیب سا ہے

خلقت بے زبان روتی ہے
ہائے وقت دعا عجیب سا ہے

روز جلتا ہے خالی کمرے میں
میرے دل کا دیا عجیب سا ہے

غزل

آنکھ میں دل کی اداسی دل میں ہے تنویرِ غم
جسم سے یہ روح تک ہے ایک ہی زنجیرِ غم

تیرے دکھ نے احترامِ درد بھی سکھلا دیا
ہجر کی آیات میں لکھی گئی تفسیرِ غم

آنکھ میں رکھے گئے جب رتجگوں کے سلسلے
خواب کی قسمت میں بھی لکھی گئی تعبیرِ غم

ایک سناٹا بچھایا آنگنوں میں خوف نے
خامشی کرتی رہی ہے شہر میں تشہیرِ غم

سانحہ ایسا تو ہوگا شہر میں کہ رات کو
روز کوئی کھینچتا ہے نالۂ شبگیرِ غم

جب ہوا چلتی ہے راتوں کو پرانی یاد کی
تو ہلاتا ہے درِ دل پہ کوئی زنجیرِ غم

پھر وہی ہونے کا رونا‘ پھر وہی امکاں کے دکھ
پھر شکستِ خواب دیکھوں پھر وہی تعبیرِ غم

اک نیا احساس دانشِ زندگی کا مل گیا
جب چلا تقدیر کی جانب سے دل پہ تیرِ غم

غزل

حالِ غم دل اس سے کہا بھی نہیں جائے
آسیب ہے وہ جس سے بچا بھی نہیں جائے

چہرے پہ جمی گہری اداسی نہیں جاتی
مشکل یہ ہے کہ رنج کہا بھی نہیں جائے

دکھ یہ بھی ہے کہ درد سمجھتا نہیں کوئی
ہنستے ہوئے ملنے کی ادا بھی نہیں جائے

کچھ دل کو بھی تنہائی و خاموشی سے الفت
کچھ گھر سے اداسی کی فضا بھی نہیں جائے

اندر کا یہ عالم ہے کہ اک حشر بپا ہے
لیکن کہیں باہر یہ صدا بھی نہیں جائے

اب درپئے جاں ہیں نئی دنیا کے نئے غم
مرنا تو مقدر ہے جیا بھی نہیں جائے

اے نیم شب ہجر کے مارے ہوئے لوگو
اب رائیگاں یہ وقت دعا بھی نہیں جائے

دانشؔ اسے گر مجھ سے محبت جو نہیں ہے
اب یہ تو نہیں اس سے ملا بھی نہیں جائے

غزل

سراب زندگی کی شام ہوگئی
یہ عمر خواب میں تمام ہوگئی

اک رائیگاں حیات تھی نصیب میں
جو نذر گردش مدام ہوگئی

میرے لئے تو سب سے قیمتی سی شے
یہ زندگی تھی، تیرے نام ہوگئی

سمجھ میں کچھ نہ آئے کہ میں کیا کروں
میرے خدایا پھر سے شام ہوگئی

اے بادشاہ وقت تیری خیر ہو
یہ زندگی تیری غلام ہوگئی

یہ سوچ کے میں رو پڑا تھا رنج سے
میرے لئے ہی مئے حرام ہوگئی

غزل

جل رہا تھا ایک منظر آگ میں
شام کو جیسے سمندر آگ میں

زندگی کا حسن سارا جل گیا
جل گیا اک پھول گر کر آگ میں

اک پرانے خواب کی تعبیر تھی
جل رہا ہے جس کا پیکر آگ میں

سوچتا ہوں دھوپ میں چلتے ہوئے
کیسے اترا تھا پیمبر آگ میں

لوگ بھینچے پھرتے ہیں محرومیاں
جی رہا ہے ایک لشکر آگ میں

شعر کہنا کار آساں تو نہیں
کوئی تو ہے میرے اندر آگ میں

خاک کی پوشاک کو پہنے ہوئے
رقص کرتا ہے قلندر آگ میں

ہجر کی ساعت تھی، تیری یاد تھی
نقش تھے کچھ پھول دل پر آگ میں

غزل

کبھی تمہاری راہ میں، نگاہ میں
یہ زندگی تھی تیری بارگاہ میں

وہ لوگ منتظر تھے صبح عید کے
جو قتل ہو گئے تھے خواب گاہ میں

فقط وفا کی بات ہی نہیں تھی وہ
کچھ اور مسئلے بھی تھے نباہ میں

حیات آ کے دور بھی نکل گئی
ہم منتظر تھے انتظار گاہ میں

اک خاک تھی کہ اڑ رہی تھی دور تک
اک آگ تھی میرے دل تباہ میں

عجیب لذتیں عجیب رنج ہیں
کبھی کسی ثواب میں، گناہ میں

یہ پوچھتے ہیں مجھ سے میرے نکتہ چیں
غزل کہی ہے آہ میں کہ واہ میں

غزل

دیا جلا ہے درمیان خواب کے
مگر ہوا ہے درمیان خواب کے

وہ راستہ عجیب ہے مسافرو
جو راستہ ہے درمیان خواب کے

یہ کون دل کی کھڑکیوں کو کھول کے
پکارتا ہے درمیان خواب کے

وہ انتظار کر رہا تھا خواب کا
جو مر گیا ہے درمیان خواب کے

میں دیکھتا ہوں روز ایک شخص کو
جو جاگتا ہے درمیان خواب کے

یہ خواب اور جاگنے کا فیصلہ
وہ کر رہا ہے درمیان خواب کے

وہ طے کبھی نہیں ہوا ہے جاگتے
جو فاصلہ ہے درمیان خواب کے

کوئی حصار ہے میرے نصیب میں
جو کھینچتا ہے درمیان خواب کے

مہک ہے اس کی زندگی کے درمیاں
جو گل کھلا ہے درمیان خواب کے

ہے روشنی اداس سے مکان میں
مگر دیا ہے درمیان خواب کے

غزل

سورج چاند ستارے مرتے جاتے ہیں
اک اک کرکے سارے مرتے جاتے ہیں

اندر کی یہ آگ کہ بجھتی جاتی ہے
شعلے اور شرارے مرتے جاتے ہیں

جتنا ڈر کر اپنا آپ بچاتے ہیں
ویسے لوگ بے چارے مرتے جاتے ہیں

جیسے جیسے رہبر بڑھتے جاتے ہیں
ویسے غم کے مارے مرتے جاتے ہیں

دل کا دکھ بھی اتنا بڑھتا جاتا ہے
جتنے روشن تارے مرتے جاتے ہیں

کیسے روئیں کیسے درد کا ماتم ہو
جگنو اور ستارے مرتے جاتے ہیں

ہم بھی دانش اپنا رستہ ناپیں گے
جیسے دوست ہمارے مرتے جاتے ہیں

آدم کے بیٹے

شب زادے!
تم اپنے بانجھ چہرے پر
یہ گہری تیرگی کی راکھ مل کے
کس سحر کی جستجو میں ہو

اجالے کی وہ دیوی
سرزمین تیرہ سے تو دور
ان دیکھے جزیروں کے مکینوں کے لئے
گل روشنی کے سرخ پھولوں کی
مہکتی سیج پر بیٹھی ہوئی
اس زندگی کی کیف آگیں
روح پرور
پر مسرت گیت گاتی ہے
تمدن مسکراتا ہے

سنو شب زاد
کیوں خوش رنگ خوابوں کے جزیروں میں
بھٹکتے ہو
انوکھی خواہشوں کے زخم سہتے ہو
تم اپنی پیٹھ تو دیکھو
جہاں پر آدمیت کی سواری کو اٹھانے کا

وہ گہرا زخم باقی ہے
اسے چاٹو

(کتوں کے لئے خود اپنے ہی زخموں میں
ساری لذت کام و دہن ہے
زخم کو چاٹو)

کہ یہ وہ زخم ہے
جس پر
تمدن کی عمارت کی نیو رکھی ہے
ہر تہذیب اس کی کوکھ سے پھوٹی ہے
اس کی پیپ ہی وہ آب امرت ہے
ازل سے جو مقدر ہے
زمانے میں
فقط ہی چند لوگوں کے
کہ اس امرت سے ہی ساری توانائی ہے
قوت، حکمرانی ہے
معیار خیر شر اس سے
تمام اعلیٰ صفات
اقدار کی
واحد نشانی ہے
تم اپنے زخم کو چاٹو

صحیفے جھوٹ کہتے ہیں
کہ ایک آدم ہے

سب اولاد ہیں اس کی
وہ مٹی سے بنا ہے
جھوٹ کہتے ہیں
الگ سب کا خدا
اور سب کا
اپنا اپنا آدم ہے۔

الجھتے ہو معموں میں
سوالوں میں
جوابوں میں
چلو خاموش ہو جاؤ
زباں پہ حرفِ ناگفتہ کی اک زنجیر پھر ڈالو
اور اپنے زخم کو چاٹو

میرا چہرہ کیا آئینہ ہے؟
جس میں عکس دیکھا اس نے
بگڑا عکس
رکھ کر ہاتھ آنکھوں پر وہ چلایا

چلو۔ یہ توڑ دو آئینہ
کرچی کرچی کر ڈالو
یہ کس کا عکس ہے
اس کو مٹا ڈالو
اجازت کس نے تم کو دی / یہاں آنے کی
سو یہ جرم ہے تیرا

تمہاری پیٹھ
ننگی پیٹھ پر کوڑا یہ ناچے گا
تمہارے ہاتھ میں
کیلیں یہ گاڑھی جائیں گی
اور تم ہمیشہ کے لئے پابند ہو
کس نے کہا تھا
تم یہاں آؤ

یہاں کتوں کا آنا تو منع ہے

کس لئے آئے یہاں پر
تم وہی ہو
جس نے حریت اور آزادی کی بارگاہ میں دعا کے
اجتماع میں

یہ کہا تھا
"خواب ہے میرا
یہ میرا خواب ہے
ایسا بھی دن آئے گا
جب بیٹے ہمارے
اپنے آقاؤں کے بیٹوں کے برابر بیٹھ کر
اس زندگی کے پر مسرت گیت گائیں گے
کہ انساں سب مساوی ہیں
ہمارے باپ نے'
ہم نے'

یہاں جو کچھ سہا ہے
ہم وہ اپنے ساتھ لے کر جائیں گے
بیٹے ہمارے
حبس آلودہ فضاؤں سے نکل کر
زندگی کی وسعتوں میں سانس لیں گے
یہ یقیں ہم کو ہے
سچائی ہمیشہ جیتتی ہے
ہم کہ سچے ہیں۔
یہ کالی رات کی دیوار
کتنی ہی بلند ہو
ریت کی ہے
توڑ ہی دیں گے

یہاں جو میں نے جھیلا ہے
میرے بیٹے نہ جھیلیں گے"
وہی ہو تم!
وہی ہونا
تمہارا خواب!
یہ دیکھو میری مٹھی میں ہے
بیٹا تیرا!
دیکھو، میرے بیٹے کا تسمہ باندھ کے
سر کو جھکائے منتظر ہے
کب نئے احکام جاری ہوں
وہ سرعت سے وہی کچھ کرنے لگ جائے
کیا ہے اس کے آباء نے جو صدیوں سے

میری آنکھوں میں وہ جادو
میرے ہاتھوں میں وہ قوت ہے
جو کچھ بھی یہاں ہم چاہتے ہیں
وہ ہی ہوتا ہے
یہ انساں کب مساوی تھے
یہ انساں کب مساوی ہیں
ہمارے ہاتھ میں جو کچھ ہے
سچائی ہے وہ
انصاف ہے
حق ہے
صداقت ہے
کہ ان ہاتھوں میں قدرت ہے
سو یہ تسلیم کر لو
سب کا اپنا اپنا آدم ہے
کہ جو کچھ واقعہ ہے
وہ حقیقت ہے
علاوہ اس کے جو کچھ ہے
فقط وہ خواب ہے

خوابوں کی دنیا سے
حقیقت کے جہاں تک کے سفر میں
فاصلے کی تلخیوں کو کس نے دیکھا ہے۔

بدصورتی کا حسن

میرے چہرے پہ تھوکو
تمہیں حق ہے میرے چہرے پہ تھوکو
کہ اس چہرے پہ رعنائی
نہ ایسی آنکھیں
جن کو دیکھ کر آہوئے وحشی کا گماں ہو

ستاروں کی چمک ان میں
نہ خوابوں کی وہ سرمستی
جو کہتے ہیں
خدا نے مشترک بانٹے ہیں انساں میں

دہکتے سیب ہیں یہ گال
نہ جاں میں توانائی
کہ جس کو دیکھ کر صدیوں پرانے دیوتاؤں کی
عظمت کا خیال آئے

دھنسی آنکھیں ہیں
جن میں ان گنت صدیوں کی اک آسودہ حالی
اور مسرت کا
فقط اک انتظار روح فرسا رقص کرتا ہے

سیاہ رنگت
کہ جس کی ہر سطر پر
ہر بن مو پر لکھا ہے
آدمیت کے ستم کی داستاں
اس کی شرافت اور نجابت کی کہانی
تمدن کی نشانی

یہ پچکی ہڈیاں گالوں کی
جن کا خون
گورے دیوتاؤں کا وہ غازہ ہے
کہ جس کی سرخ رنگت سے
جلال ان کا ہے تابندہ
خمار بے کراں زندہ
کہ پوری آدمیت جس کے دم سے
ان کے آگے سرنگوں ہے
سراسیمہ' پریشاں' گومگو ہے

سیاہ رنگت
یہ پچکی ہڈیاں
اور یہ دھنسی آنکھیں
معیار حسن دنیا کا
مقرر جو بھی ہے اس کے مطابق
کوئی بھی تو شے نہیں ہے
یہ فقط بدصورتی ہے
تھوک دو اس پر

مگر یہ جان لو
اس رنگ پر' اس کالے چہرے پر
کہیں انسانیت کے خون کا دھبہ نہیں ہے

احتجاج

ہوا جب تک میرے اس جسم کی دیوار کو
بوسیدہ چھلنی کی طرح
سوراخ در سوراخ کرلیتی نہیں
میں سانس لینے کی کوئی قیمت نہیں دوں گا۔

یہ آندھی'
جب تلک گھر کے اندھیرے سرد کونے میں
مسلسل ٹمٹماتی بوڑھی بتی کو
بجھا دیتی نہیں
میں روشنی کے ہاتھ بیعت کے لئے
اپنے یہ سوکھے ہاتھ
اوپر نہ اٹھاؤں گا۔

نیا سورج طلوع جب تک نہیں ہوگا
میں گلیوں' آنگنوں
کچے مکانوں
شہر کی ویران سڑکوں
اور دیواروں پہ تاریکی ملوں گا
تیرگی پھیلاؤں گا

سورج (نیا سورج)

طلوع جب تک نہیں ہو گا
میں سارے کوسنے
اور گالیاں
ہر صبح ہوا کے دوش پہ رکھ کر
اسے پیغام بھیجوں گا۔

یہاں جب لوگ
تاریکی میں گھٹ کے مر رہے ہوں گے
ہنسوں گا
کوسنے دوں گا
کہ میں مرنے سے پہلے
اک دفعہ
بس اک دفعہ جی بھر کے جینا چاہتا ہوں۔

میں، کہ جو صدیوں پرانے گھر کے
تیرہ کمرے میں پیدا ہوا تھا
بے حس و مردہ
سیاہ جسم اور زخمی روح کے ہمراہ!

مگر اس بار میں مرنے سے پہلے
ہنستے سورج کی شعاعوں میں نہانا چاہتا ہوں
جس کی خاطر
شہر کی گلیوں
مکانوں، آنگنوں
سڑکوں، دیواروں پر
میں تاریکی بچھاتا ہوں۔

غزل

ٹوٹتے بجھتے ستاروں کا سماں مت دیکھنا
نیم شب کی چپ میں سوئے آسماں مت دیکھنا

کیا پتہ لے جانے والی کونسی وہ لہر ہو
تم کنارے بیٹھ کے آبِ رواں مت دیکھنا

دوپہر کی چپ میں یا سنسان راہوں میں اگر
پیچھے سے کوئی پکارے ناگہاں مت دیکھنا

دیکھنا وہ بھی جو خوابوں کی حدوں سے ہے پرے
ہاں مگر جو دیکھنا ہے وہ سماں مت دیکھنا

ہر سفر میں یاد آکر رنج دیتا جائے گا
دور ہوتی بستیوں کا یہ دھواں مت دیکھنا

دکھ اٹھالینا کہاں مشکل ہے پر اس کے لئے
حوصلے کو دیکھنا' بارگراں مت دیکھنا

ہاں وہ پھر رستے میں تنہا چھوڑ دے کہ مار دے
جب محبت کی ہے تو سود و زیاں مت دیکھنا

یہ عجب ہی شہر ہے ٹھہرے تو پتھر کے ہوئے
تم کسی کی سمت بھی رک کر یہاں مت دیکھنا

جب یہاں دانش سبھی لہجے ہی یکساں ہو گئے
تم بیاں کو دیکھنا، طرزِ بیاں مت دیکھنا

غزل

راستہ چلتے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے
بس یونہی رکتے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے

گر ضروری بات بھی کہنی ہو تو اس کے لئے
بے سبب ہنستے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے

یہ ضروری ہے کہ ہم کو یاد ہوں سارے سبق
یہ سبق پڑھتے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے

وہ ادھوری خواہشیں ہوں یا پرانے خواب ہوں
رات دن کرتے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے

ہر کہانی کو نئی ترتیب دینے کے لئے
داستاں کہتے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے

سامنے منظر ہو اور پیش نظر کچھ بھی نہ ہو
آئینہ تکتے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے

زندگی اک یاد ہے، گہری پرانی یاد ہے
زندگی کرتے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے

کچھ کسی کی دھیان میں اور کچھ خوشی کی لہر میں
گفتگو کرتے ہوئے کچھ بھول جانا چاہئے

غزل

ایسا لگتا ہے جہاں کے درمیاں اک رنج ہے
اس زمیں اور آسماں کے درمیاں اک رنج ہے

ایک لامحدود تنہائی میرے سینے میں ہے
خالی کمرے اور مکاں کے درمیاں اک رنج ہے

اس کہانی کے تسلسل میں خوشی اپنی جگہ
ہاں مگر اس داستاں کے درمیاں اک رنج ہے

یوں تو یہ بہتی چلی جاتی ہے اپنی موج میں
ہاں مگر عمر رواں کے درمیاں اک رنج ہے

واقعے تو ناگہاں ہوتے ہی ہیں پر دہر میں
واقعے اور ناگہاں کے درمیاں اک رنج ہے

زندگی تو رائیگاں ہوتی ہی ہے دکھ ہے تو یہ
زندگی اور رائیگاں کے درمیاں اک رنج ہے

جو ہوا معلوم ہے لیکن عیاں کیسے وہ ہو
جو کہانی اور بیاں کے درمیاں اک رنج ہے

سر خوشی اپنی جگہ لیکن کبھی لگتا ہے یوں
یاد یار مہرباں کے درمیاں اک رنج ہے

غزل

ملال یہ نہیں دیوار و در نہیں گھر میں
عذاب یہ ہے کوئی معتبر نہیں گھر میں

میں سوچتا ہوں یہ پتھر کہاں سے آئے ہیں
پڑوسیوں کو خبر ہے شجر نہیں گھر میں

کوئی بھی آئے وہ ہم کو بچا نہیں سکتا
کوئی پناہ کی صورت اگر نہیں گھر میں

فضا کے ساتھ زمیں رنگ بدلتی جائے
اور اب جو ہوگا کوئی بے خبر نہیں گھر میں

عمارتوں کی بلندی میں دب گئے رشتے
فقط مکان ہیں اب کوئی گھر نہیں گھر میں

کسی سبب جو کوئی حادثہ نہیں ہوتا
تو سوچتا ہوں یہ دانش کہ ڈر نہیں گھر میں

غزل

ہیں جہان بھر کی مسافتیں تیرے خواب سے میرے خواب تک
وہی فاصلوں کی عبارتیں تیرے خواب سے میرے خواب تک

کوئی زینہ گھرے ملال کا میری روح سے تیری روح تک
اسی ایک غم کی حکایتیں تیرے خواب سے میرے خواب تک

وہی ایک دشت فراق ہے وہی ایک شہر ملال ہے
وہی نیم شب کی ہیں وحشتیں تیرے خواب سے میرے خواب تک

وہی اک سفر جو ہے رائیگاں وہی راستے جہاں دیکھیے
وہی عکس ہے وہی صورتیں تیرے خواب سے میرے خواب تک

سبھی جھیلتے یہ عذاب ہیں سبھی بھوگتے یہی خواب ہیں
یہ شکست، درد، ہزیمتیں تیرے خواب سے میرے خواب تک

یہ ہیں خون دل سے لکھی ہوئی غم مشترک کی حکایتیں
ہیں ورق ورق پہ جو آیتیں تیرے خواب سے میرے خواب تک

میں کسے بتاؤں کہ کیا ہے اب میں کسے سناؤں کہ کیا ہے غم
جو گزر رہی ہیں قیامتیں تیرے خواب سے میرے خواب تک

غزل

یادیں پاگل کر دیتی ہیں
باتیں پاگل کر دیتی ہیں

چہرہ ہوش بھلا دیتا ہے
آنکھیں پاگل کر دیتی ہیں

تنہا چلنے والوں کو، یہ
راہیں پاگل کر دیتی ہیں

دن تو خیر گزر جاتا ہے
راتیں پاگل کر دیتی ہیں

دو شعر

خوں بہنے کا شور سنائی دیتا ہے
چپ رہنے کا شور سنائی دیتا ہے

لب ہلتے ہیں پر آواز نہیں آتی
کچھ کہنے کا شور سنائی دیتا ہے

ان کہی کا دکھ

میں اس کی ان کہی باتیں
اور اس کے ان کہے دکھ
سب سمجھتا ہوں
وہ باتیں
جو کبھی اظہار کا لمس آشنا بھی ہو نہیں پائیں
وہ باتیں
جو کہی باتوں کے پس منظر میں رہتی ہیں
جو آنکھوں کی زباں سے
نہ اشارے اور کنائے
جنبش ابرو
لبوں کی مسکراہٹ سے عیاں ہوں
نہ کبھی گھمبیر معنی خیز خاموشی سے ہی
اظہار ہو جن کا
مگر وہ جب بھی پیشانی کی ہر سلوٹ میں
سالہا سال کی گہری ریاضت کی تھکن کی گرد لے کر
سوچ میں گم ہو
تو اس کی ان کہی باتیں
اور اس کے ان کہے دکھ
میرے سینے میں اترتے ہیں
اور میری آنکھیں
کسی نادیدہ غم سے بھیگ جاتی ہیں

زندگی اتنی آساں نہیں

زندگی اتنی آساں نہیں
جیسے تتلی کے رنگوں سے لکھی ہوئی کوئی تحریر ہو
جو نگاہوں کی حدت پڑے تو
ہواؤں میں تحلیل ہو

زندگی اتنی آساں نہیں
جیسے بچے کا ننگے بدن دھوپ میں کھیلنا
اس کے خوابوں کی گہری گھٹا
اس پہ سایا فگن
اس کے حاصل کھلونوں، گھروندوں کی جاگیر ہو

زندگی اتنی آساں نہیں
جیسے ٹوٹی ہوئی چارپائی پر
اپنی تمناؤں کے باگ تھامے ہوئے
جاگتے خواب کا دیکھنا
اور خوابوں کے میدان میں
دل کی ہاری ہوئی جنگ کا جیتنا

زندگی اتنی آساں نہیں ہے
کہ جس کے لئے ہم ہر اک سانس مرتے رہیں
کاروبارِ جہاں

دن کی مصروفیت
رات کا جاگنا
روز مرہ کے معمول کا یہ خلا
ہم جسے اپنی سانسوں میں بھرتے رہیں
زندگی اتنی آساں نہیں
زندگی اتنی آساں نہیں

لیاری

ابھی سو رہے ہو
زمانہ تمھیں روند کر جا رہا ہے
زمانہ تمھیں روند کر جا چکا ہے
مگر سو رہے ہو

میں کب سے کھڑا ہوں تیرے در کے آگے
میں چلا کر اب تھک چکا ہوں

تمھیں کوئی صور قیامت جگائے
تو کیا پھر بھی تم
یونہی سوتے رہو گے

تمھیں یہ خبر ہی نہیں ہے
زمانہ کہاں جا چکا ہے

وہ ندی
تیرے در کے آگے
جو بہتی چلی جا رہی تھی

سمندر ہوئی ہے
سمندر کے پھیلاؤ کی کچھ خبر ہے؟

تمھیں کیا خبر ہے
تمھیں اپنے حجرے سے باہر نکلنے کی فرصت ملے بھی
تو دیکھو

مگر تم یہ دیکھو گے کیسے
تمھاری تو آنکھیں نہیں ہیں
تمھیں تو تمھارے ہی غم کی تمازت نے
اندھا کیا ہے

اور اندھے کی قسمت!
عصا اور روٹی کا ٹکڑا

یہ کتا جو دروازے پر دم دبائے ہوئے ہے
تمھارا محافظ؟
یہ دریوزہ گر ہے
اسے کوئی نانِ شبینہ
کوئی خواب دکھلا کے
پھسلا کے
زنجیر کر دے

یا دھتکار دے
اس کی قسمت یہی ہے

تمھیں کچھ خبر ہے

وہ "مائی" جو صدیوں سے تیرے لئے
خواب بنتی رہی ہے

وہ خود اپنے خوابوں کی
پرچھائیں میں قید ہے
رو رہی ہے

یہ کیا ہو رہا ہے
یہ کیا ہو گیا ہے

یہ تم تھے
وہ جس نے سمندر کے سینے پر سر رکھ کر
اس کی محبت کو
پہلے پہل اپنی روح میں اتارا

سمندر سے تیری رفاقت
سمندر سے تیری محبت
کہانی نہیں ہے

سمندر تھا کٹیا
جہاں سو رہے ہو
سمندر تھی دنیا
جہاں کھو گئے ہو

سمندر جو سفاک ہے

پر تمہارے لئے اس کے دل میں
فقط ماماتا ہے

سمندر رواں ہے
سمندر تو رکتا نہیں ہے
نکل کر تو دیکھو
یہ پانی کہاں جا چکا ہے
خفا ہے وہ ہم سے
خفا ہے وہ تم سے
مگر پھر بھی تم کو ڈبوتا نہیں ہے
(اگر وہ ڈبو دے تو برحق ہے لیکن)
مگر پھر بھی ایسا وہ کرتا نہیں ہے

کہ اب اس کے سینے پہ
سڑکیں، عمارت
ہجوم و سیاست
لہو، روشنی، خواب
ہنگامے، نعرے
تشدد و نفرت کی دنیا بسی ہے
مگر تم کہاں ہو
میں کب سے ترے در کے آگے کھڑا ہوں
جہاں سوکھی مچھلی کی بو
اور افلاس
صدیوں کی گہری مشقت سے منجمد ہیں

غزل

کوئی سایا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے
مر جاؤں گا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

سانولی رت میں خواب جلے تو آنکھ کھلی
میں نے دیکھا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

اب کے موسم یہی رہے تو مر جائے گا
اک اک لمحہ اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

کوئی ٹھکانہ بخش اسے جو گھوم رہا ہے
مارا مارا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

ایک تو دل کے رستے بھی دشوار بہت ہیں
پھر میں پیاسا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

کوئی سایا آگ میں جلنے والوں پر بھی
کوئی پروا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

رات کو اک پاگل نے شہر کی دیواروں پر
خون سے لکھا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

اچھے سائیں مان لیا دنیا ہے روشن
لیکن یہ کیا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

کون تھا جس سے دل کی حالت کہتا میں
کس سے کہتا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

غزل

وہ دنیا اور ہوتی ہے جہاں کچھ اور ہوتے ہیں
محبت میں زمین و آسماں کچھ اور ہوتے ہیں

وہ غم کچھ اور ہوتے ہیں جو بن کر پھول کھلتے ہیں
وگرنہ درد و رنج رائیگاں کچھ اور ہوتے ہیں

وہ منظر اور ہوتا ہے جو آنکھوں سے گزرتا ہے
ٹھہر جاتے ہیں جو دل میں سماں کچھ اور ہوتے ہیں

یہ ناموجود اور موجود چیزوں میں سحر کیا ہے
نمایاں اور ہوتے ہیں نہاں کچھ اور ہوتے ہیں

ہر اک ویراں مکاں اک داستاں ہوتا تو ہے لیکن
مگر برباد ہونے کے نشاں کچھ اور ہوتے ہیں

کہانی اور بیاں اور آنسوؤں کے بیچ میں دانش
کہیں کچھ ان کہے غم درمیاں کچھ اور ہوتے ہیں

غزل

رات گئے تک جاگتے رہنا دکھ نہ کسی سے کہنا
دن بھر ہنستے بولتے رہنا دکھ نہ کسی سے کہنا

اجڑی زرد ملول آنکھوں میں رنج چھپانے کو
خوابوں کے رس گھولتے رہنا دکھ نہ کسی سے کہنا

چیختے پھرتے لوگوں کو دن بھر دیوانہ وار
چھت پر چڑھ کر دیکھتے رہنا دکھ نہ کسی سے کہنا

بے معنی بے مصرف سا دن اوڑھ کے گلیوں میں
اپنے آپ سے کھیلتے رہنا دکھ نہ کسی سے کہنا

بارش میں جب جلتے گھر ہوں آنکھوں کے آگے
دور خلا میں گھورتے رہنا دکھ نہ کسی سے کہنا

دیواروں پر حرف لکھے ہوں یا آوازیں ہوں
خالی آنکھوں سوچتے رہنا دکھ نہ کسی سے کہنا

غزل

میں، تنہائی گھرے سائے سرد ہوا اور رات
گھر کے اندر آگ لگائے سرد ہوا اور رات

ایک ان دیکھے دکھ کا موسم آنکھوں کی جاگیر
انجانے غم کے دو سائے سرد ہوا اور رات

بیٹھے ہیں پھر اگلے موڑ پہ دکھ کی آگ لئے
میری راہ میں نین بچھائے سرد ہوا اور رات

روز فصیل دل پر اترے تنہائی کا چاند
روز نئے دکھ یاد دلائے سرد ہوا اور رات

روز نیا اک چہرہ آکر مجھ سے بات کرے
روز نئے طوفان دکھائے سرد ہوا اور رات

ایک دن اپنے دکھ کا وہ بھی حصہ جھیلیں گے
جن بچوں کو روز ڈرائے سرد ہوا اور رات

رستے میں تھک ہار کے بیٹھے لیکن دل کی بات
کون کہے اور کون سنائے سرد ہوا اور رات

میں نے پھر اب شہر غم میں گھر آباد کیا
پھر میرے ہیں دو ہمسائے سرد ہوا اور رات

اس کی آنکھوں میں دنیا کی روشن سی تصویر
جس نے خود ورثے میں پائے سرد ہوا اور رات

دانش اس نے چپ کے سے یہ جاتے وقت کہا
شالا تجھ کو رب دکھلائے سرد ہوا اور رات

تین شعر

اب یہ کھلا وہ سارا ایک سفر تھا بہتے پانی پر
بنیادیں مٹی میں تھیں اور گھر تھا بہتے پانی پر

یادوں کی اک جھیل میں سرخ گلاب سے کھلتے رہتے تھے
تیرے خواب اور خواہش کا منظر تھا بہتے پانی پر

وقت شکاری گھات میں تھا معصوم پرندہ کیا کرتا
خون کی ایک لکیر تھی اور اک پر تھا بہتے پانی پر

غزل

قربتوں میں بھی ہے دوریوں کا خلا درمیاں کون ہے
اور بھی پاس جاکر اسے چھو کے دیکھو ذرا درمیاں کون ہے

دونوں جلتے ہیں اک آگ میں پھر بھی دوری عجب
بات کیا ہے کہ ملتے نہیں روشنی اور دیا درمیاں کون ہے

کون ہے جو کہ ہر روز لمبی مسافت ان آنکھوں میں بھر جاتا ہے
خواب و تعبیر میں کیوں ہے یہ فاصلہ درمیاں کون ہے

کون ہے جس کو پانے کی حسرت لئے جان سے سب گزر جاتے ہیں
گر رگ جاں سے نزدیک تر ہے خدا درمیاں کون ہے

ایک دشمن کے لئے نظم

زندگی کو
الٹا پہن کر چلنے والی لڑکی
آخری جنگ بھی ہار گئی

خوش رہنے کی بہت سی باتیں

یونہی پڑھتے ہوئے مجھکو
تمہاری یاد کے آسیب نے گھیرا
خیال آیا مجھے
دنیا میں خوش رہنا کوئی مشکل نہیں ہے
بہت سی ایسی باتیں ہیں
جنہیں ہم سوچ کے ہنس سکتے ہیں ۔۔۔۔ کتنے
یہاں پر کام ایسے ہیں
جنہیں کرنا مسرت ہی مسرت ہے
یونہی پڑھتے ہوئے مجھکو خیال آیا
تمہاری یاد میں پھیلے ہوئے خوشیوں کے سارے رنگ
میری روح کی دیوار پر
سرشاری کے وہ نقش بنتی ہیں
ازل سے جو خدا نے برگزیدہ ہستیوں کے ہی فقط قسمت میں لکھے ہیں
کوئی تتلی
مہکتی جھومتی / پھولوں کے اوپر رقص کرتی
دھوپ میں اڑتی ہوئی
خود اپنی الفت کے نشہ میں گم
دہکتی جون کی گرمی سے بے پرواہ
(محبت میں عجب سرشاری ہے
جیسے تمہاری یاد کے لمحات میں ہر ایک شے میں بھول جاتا ہوں)
جھلتی دوپہر میں ننگے پاؤں گھومتا بچہ
جسے چڑیا پکڑنے کا جنوں
گھر سے اٹھالایا ہے باہر

اس کی ساری زندگی
زندگی کی معنویت
ساری خوشیاں
دوپہر میں ننگے پاؤں گھومنے
چڑیا پکڑنے کی ہی لذت میں ہے پوشیدہ
(کسی کی آرزو میں
دوپہر کو ننگے پاؤں گھومنا
کتنا مسرت افزا ہے جاناں)
کوئی پاگل کہ جس کی ساری خوشیاں
سارے سپنے
ایک سچائی کی خاطر ہیں
کہ اس کا آدرش
انسانیت کے خواب بننا ہے
فقط سچ کے لئے سولی پہ چڑھنا
زہر پینا ہے
یا اپنی زندگی جبری جلاوطنی کے صحرا
اور کالی کھوٹھری میں نذر کرنی ہے
(کہ جیسے میں
تمہارے خواب کی سولی پہ چڑھ کے جی رہا ہوں
اور تمہاری چاہتوں کا زہر پیتا ہوں
تمہاری یاد کے صحرا میں رہتا ہوں)
کہ خوش رہنے
خوشی سے جینے مرنے کے لئے کافی
کسی سے پیار کرنا ہے
میں جیسے تم سے کرتا ہوں

میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں

میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں
شام کا پہلا ستارا کب نکلتا ہے
پرندے کونسے موسم میں ہجرت کرتے ہیں
اور پھول کس موسم میں کھلتے ہیں
پرانے چوک پر کس کا مجسمہ نصب ہے
یہ ہوا کے شور سے کھلتے ہوئے در
درد سے پتھرائی آنکھیں
کونسا رستہ کدھر جاتا ہے
سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں

میں جن کے ساتھ دن بھر رہتا ہوں
ہنستا ہوں
روتا ہوں
اب ان کی صورتیں کیسی ہیں
ان کے نام کیا ہیں
کیا وہ زندہ ہیں
کہ مردہ ہیں
میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں

میرے بوسیدہ دروازے پہ کس کے نام کی تختی لگی ہے
ناشتہ میں کیا ملا تھا

صبح جب میں گھر سے نکلا تھا
تو کیا "میں" تھا
یا کوئی اور میرے بھیس میں تھا
یہی ویران چوراہا
جہاں میں اب کھڑا ہوں
وہ گلی جس سے میں روزانہ گزرتا ہوں
وہ کھڑکی جو مجھے ہر شب بلاتی ہے
وہ رستہ جو مجھے آواز دیتا ہے
وہ آنکھیں جو میرے ہمراہ چلتی ہیں
وہ دل جو میرے سینے میں دھڑکتا ہے
وہ آہٹ
جو میرے قدموں کی ہے
وہ خواب
جو گلیوں میں آوارہ پھرا کرتا ہے
مجھکو دیکھ کے نفرت سے ہنستا ہے
یہاں جو شخص میرا منتظر ہے
میری محبوبہ، میرا دشمن
یہ میرے دوست،
ملنے والے
سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں

غزل

سایا نہ سائے کا پتا پھر بھی عجیب خوف ہے
کوئی نہیں ہے دوسرا پھر بھی عجیب خوف ہے

کوئی نہیں راہ میں زندہ ہو جس کا عکس بھی
شہر کا شہر سو گیا پھر بھی عجیب خوف ہے

اجلی چمکتی راہ پہ شہر کی ہر دکان پہ
کیسا لگا ہے جھمگٹا پھر بھی عجیب خوف ہے

قہقہے اور شور ہے محفلیں اور دوست ہیں
دیکھو تو کچھ نہیں ہوا پھر بھی عجیب خوف ہے

صبح سے لے کے شام تک کچھ بھی نہیں ہوا یہاں
کوئی ہوا نہ حادثہ پھر بھی عجیب خوف ہے

آگ اور دھول بھی نہیں بچے ملول بھی نہیں
میں بھی سلامت آگیا پھر بھی عجیب خوف ہے

اب بھی بہت سے خواب ہیں زندہ ہے آدمی ابھی
زندہ تو ہے ابھی خدا پھر بھی عجیب خوف ہے

لوگ مرے، تو ٹھیک ہے شہر کو کیوں ملال ہو
روز کا ہے یہ واقعہ پھر بھی عجیب خوف ہے

اپنی زمیں پہ دربدر، اپنے لہو میں تر بتر
سب کچھ ہی میں نے سہہ لیا پھر بھی عجیب خوف ہے

غزل

یہ اجاڑ تنہائی کونسی نئی شے ہے
شہر بھر میں رسوائی کونسی نئی شے ہے

رات کیا انوکھی تھی نیند کیوں نہیں آئی
درد کی یہ پروائی کونسی نئی شے ہے

اس میں رنگ کیا بھرتے اس کو نام کیا دیتے
شام کی یہ تنہائی کونسی نئی شے ہے

خون دیکھتا ہوں میں دل سے لے کر گلیوں تک
یہ عذاب بینائی کونسی نئی شے ہے

اس میں بات کیا ہے کہ وہ عجیب لگتا ہے
آدمی کی گہرائی کونسی نئی شے ہے

کیا میں کوئی تنہا ہوں جس پہ لوگ ہنسے ہیں
شہر بھر رسوائی کونسی نئی شے ہے

اب تو راستہ چلنا کس قدر قیامت ہے
گو یہ آبلہ پائی کونسی نئی شے ہے

خود سے بات کرنا بھی اب عجیب لگتا ہے
گو یہ رسم تنہائی کونسی نئی شے ہے

غزل

شام کی ہوا چلی اور دل اداس تھا
آگ سی دہک اٹھی اور دل اداس تھا

یاد آگیا مجھے خواب رائیگاں کوئی
ایک لہر سی اٹھی اور دل اداس تھا

وہ سفر عجیب تھا وہ سفر جو کٹ گیا
کیا حسین شام تھی اور دل اداس تھا

خواب سارے تھے نئے چاہتیں قدیم تھیں
تھی نئی نئی خوشی اور دل اداس تھا

محفلوں میں بیٹھ کر دوستوں کے درمیاں
گونجتی رہی ہنسی اور دل اداس تھا

یونہی چلتے راہ میں تم کبھی جو مل گئے
تم سے ہنس کے بات کی اور دل اداس تھا

اک کمی تیرے بغیر جو کہ عمر بھر رہی
کٹ گئی یہ زندگی اور دل اداس تھا

جب تلک وہ ساتھ تھا رنج کھینچتے رہے
جب وہ دھوپ ڈھل گئی اور دل اداس تھا

یاد کے دیئے کے لو دل کا ہمسفر کی جسے
رات جاگتی رہی اور دل اداس تھا

قمقموں کے درمیاں سائے رینگتے رہے
ہر طرف تھی روشنی اور دل اداس تھا

کونسے خیال نے دیپ سے جلا دیئے
یاد آگیا کوئی اور دل اداس تھا

چاند بھی وہ ڈھل گیا رات بھی وہ کٹ گئی
مجھ کو نیند آگئی اور دل اداس تھا

غزل

گزرے سفر کے عکس میں دیکھا سایا، دھندلا آئینہ
عمر رواں کا ہیں اک حصہ، سایا، دھندلا آئینہ

گہرے خواب سے جاگنے والے جیتے جی مر جاتے ہیں
ان کے لئے پھر ساری دنیا، سایا، دھندلا آئینہ

جانے کون تھے رہنے والے جانے بستی کیوں اجڑی
دیواروں پر محو گریہ، سایا، دھندلا آئینہ

ہجر گزیدہ ساعت میرے آگے پیچھے پھرتی ہے
گزرے وقت کا لمحہ لمحہ، سایا، دھندلا آئینہ

عمر کی اک بے نام مسافت میری ذات کا حصہ ہے
دل سے اب دنیا کا رشتہ، سایا، دھندلا آئینہ

زہریلی رت کی سازش سے سارے سپنے بانجھ ہوئے
اس کی آنکھیں اس کا چہرہ، سایا، دھندلا آئینہ

گھر کے اندر تنہائی کے پنچھی آکر بیٹھ گئے
دیواروں پر جالے بنتا، سایا، دھندلا آئینہ

اب کی رت میں گھر کا منظر درد کے موسم جیسا ہے
سرد منڈیر پہ سہمی چڑیا سایا، دھندلا آئینہ

سارے اچھے موسم اس کی آنکھوں کی جاگیر ہوئے
جس نے میرے دل پہ لکھا سایا، دھندلا آئینہ

غزل

جانے کیسا غم ہے خالی کمرے میں
یہ کس کا ماتم ہے خالی کمرے میں

خالی کمرہ کتنا سونا لگتا ہے
جیسے کوئی کم ہے خالی کمرے میں

ساری دنیا خالی کمرہ لگتی ہے
اور دنیا کا غم ہے خالی کمرے میں

دیواروں پر ایک ستارا روشن ہے
یا اک چشم نم ہے خالی کمرے میں

صدیوں کی کچھ راز بھری آوازیں ہیں
اک گریہ پیہم ہے خالی کمرے میں

بستر کپڑے، موزے، کرسی، پرچھائیں
اک دنیا باہم ہے خالی کمرے میں

وحشت ہے نہ غصہ ہے نہ تنہائی
جانے کیا موسم ہے خالی کمرے میں

ساری دنیا کمرے میں آ جاتی ہے
جیسے اک عالم ہے خالی کمرے میں

خالی کمرے میں جو چھپ کر بیٹھا ہے
دانش یا گوتم ہے خالی کمرے میں

غزل

سنا ہے میں نے یہ اوروں سے ان دنوں وہ مجھے
بلا رہا ہے مگر دیر ہو گئی شاید

وہ مجھ کو جاگتی راتوں کے ان کہے قصے
سنا رہا ہے مگر دیر ہو گئی شاید

وہ مجھ کو اپنے بچھڑنے کی ناگزیر وجہ
بتا رہا ہے مگر دیر ہو گئی شاید

وہ مجھ کو یاد کے چہرے پہ جھریوں کے نشاں
دکھا رہا ہے مگر دیر ہو گئی شاید

بلا رہے تھے اسے لوگ کتنی مدت سے
وہ آ رہا ہے مگر دیر ہو گئی شاید

وہ ایک شمع غم زندگی مٹانے کو
جلا رہا ہے مگر دیر ہو گئی شاید

وہ غم جو حاصل عمر رواں ہے اب وہ اسے
بھلا رہا ہے مگر دیر ہو گئی شاید

یہ زندگی بھی عجب ہے کہ اب اسے دانش
بتا رہا ہے مگر دیر ہو گئی شاید

غزل

یہ سلسلہ بھی خواب اور دل کے درمیان ہے
یہ زندگی عذاب اور دل کے درمیان ہے

میں جل بجھا تو یہ کھلا وہ آگ کوئی اور تھی
وہ آگ جو گلاب اور دل کے درمیان ہے

ہے وہ ضمیر آدمی کے روح پر لکھا ہوا
وہ حرف جو کتاب اور دل کے درمیان ہے

اب اور سلسلے ہیں زندگی کے اور عشق کے
اب اور کچھ نصاب اور دل کے درمیان ہے

کوئی بتائے کیا کہ روح کس لئے ہے وجد میں
وہ ربط جو رباب اور دل کے درمیان ہے

اک ایسا رنج بھی ہے جو کسی بیان میں نہیں
وہ رنج جو سراب اور دل کے درمیان ہے

شناوری ہی کھیل ہے اس امتحان گاہ میں
یہ زندگی چناب اور دل کے درمیان ہے

جو زندگی گزر رہی ہے خوف اور جبر میں
وہ زندگی حساب اور دل کے درمیان ہے

غزل

گلیوں کی بس خاک اڑا کے جانا ہے
ہم کو بھی آواز لگا کے جانا ہے

رستے میں دیوار ہے ٹوٹے خوابوں کی
ہم کو وہ دیوار گرا کے جانا ہے

ہم بھی اک دن آئے گا مر جائیں گے
ہم کو بھی یہ رسم نبھا کے جانا ہے

جو بھی ہے وہ سب مٹی ہو جائے گا
ہم کو بس اک خواب بچا کے جانا ہے

میرے اندر صدیوں کی خاموشی ہے
تم کو وہ آواز سنا کے جانا ہے

تم کو بھی اک خواب مکمل کرنا تھا
ہم کو بھی تصویر بنا کے جانا ہے

غزل

جل بجھا رات کے سناٹے میں
اک دیا رات کے سناٹے میں

دل کی وسعت سے روز اٹھتی ہے
اک صدا رات کے سناٹے میں

دن کو شمشیر سی لٹکتی تھی
خوف تھا رات کے سناٹے میں

سارے دکھ یاد سے کیوں آتے ہیں
اے خدا رات کے سناٹے میں

ہجر، غم کا گلاب تھا ایسا
جو کھلا رات کے سناٹے میں

کس نے شب بھر مجھے صدائیں دیں
کون تھا رات کے سناٹے میں

رات کٹ جائے گی تو مانگا کر
اب دعا رات کے سناٹے میں

اک صدا سی ابھر کے ڈوب گئی
کیا ہوا رات کے سناٹے میں

زندگی جس نے دھوپ میں کاٹی
مر گیا رات کے سناٹے میں

دل سے سرگوشیاں سی کرتی ہے
یہ ہوا رات کے سناٹے میں

اپنی پرچھائیوں سے لڑتا ہے
اک دیا رات کے سناٹے میں

امید

میرے خوابوں کے تھیلے میں
جو بھی ہے سب بوسیدہ ہے
ایک پرانی سی چادر ہے
اک زنگ آلودہ تلوار
بے حرمت سا ایک قلم ہے
بازاری سی ایک کتاب
صدیوں کا بیمار ذہن ہے
زیست کا اک بدکار نصاب
ان سب مردہ چیزوں میں بس
میری آنکھیں زندہ ہیں
میں ان میں پھر رکھوں گا اب
خاموشی کا پہلا باب
جس کا آخری منظر ہوگا
ایک نیا اور زندہ خواب

یادیں

یوں تو وقت گزرتا ہے۔۔۔اور
سارے منظر
اک اک کر کے
مرتے جاتے ہیں
زندہ رہنے والی آنکھیں
بس زندہ رہ جاتی ہیں
لیکن ساری عمر سوال یہ رہتا ہے
خاموشی کے غار میں کیسی آوازیں ہیں
گھر سے باہر کون صدائیں دیتا ہے

نفی

تیرے چہرے پہ ابھری
لکیروں کی تہہ میں
کسی اور کے عکس کو دیکھ کے میں نے
خود اپنے ہاتھوں سے
تیرے لئے لکھی نظموں پہ
ہنستے ہوئے خط تنسیخ کھینچا

انا

کوئی دیوار دل میں ہے
جو ہر آواز کو
احساس کو
آنے نہیں دیتی
میں تنہائی سے گھبرا کر
نکلتا ہوں کہ رکھ دوں توڑ کر دیوار
لیکن درمیاں
ایسی کوئی شے ہے
جو تیرے اور میرے بیچ لازم ہے
سو میں دیوار کو گرنے نہیں دیتا

فریب

منفرد اور ممتاز بننے کی خواہش عجب ہے
کسی "اور" کولاد کے خود پر
یہ جینے والے نہیں جانتے ہیں
کہ جب بھی وہ تنہائی کے اک
کسی خاص لمحے میں
اپنے مقابل کھڑے ہوں گے
تو سامنا اجنبی ایک چہرے سے ہو گا
کسی "اور" کولاد کے
منفرد اور ممتاز بننے کی خواہش میں
وہ نہ رہیں گے
جو وہ اصل میں تھے

اچھی آنکھوں والی کے لئے ایک نظم

جھلمل، روشن، ہرنی جیسی جگنو چمکتی آنکھوں میں
سارے اچھے موسم، تارے
پھول اور تتلی
دھوپ اور سائے
دل کی وسعت اور سمندر کی گہرائی
پنکھ پھیلائے بیٹھے ہیں

وہ آنکھیں
کہ جس کی باتیں
اچھے پرندوں کی بولی میں
سچے خوابوں کے لہجے میں
سرگوشی کے جال بنیں
وہ آنکھیں کہ جن کا لہجہ
سچے سکھ اور سچے دکھ کا
اک شفاف سا آئینہ
جس میں اس کی خوابوں کے
سب رنگ منعکس ہوتے ہیں
لیکن ان رنگوں میں میرے نام کا کوئی عکس نہیں

میں نے دل کے خوں میں
اپنے خواب کے سارے رنگ ملا کر
جس کے نام پہ پہلا شعر پہلا خواب اور پہلا پیار
لکھا ہے

غزل

دل میں جو تصویر دکھائی دیتی ہے
خوابوں کی تعبیر دکھائی دیتی ہے

رستے سارے سرخ گلاب سے دکھتے ہیں
پاؤں میں زنجیر دکھائی دیتی ہے

جو بھی میرے سامنے آتا رہتا ہے
قسمت کی تحریر دکھائی دیتی ہے

تنہائی کی اپنی باتیں ہوتی ہیں
خاموشی تفسیر دکھائی دیتی ہے

میں بھی اپنے وقت کا رانجھا لگتا ہوں
وہ بھی مجھ کو ہیر دکھائی دیتی ہے

جن جسموں پر زخموں کے ملبوس سجے
آنکھوں میں تنویر دکھائی دیتی ہے

جو سچ بولیں، زہر پئیں، اس جیون کی
ان سے ہی توقیر دکھائی دیتی ہے

غزل

یاد آئے ہیں یار دیرینہ
ہائے وہ غم گسار دیرینہ

یاد رکھتا ہوں زخم تازہ کو
بھول جاتا ہوں وار دیرینہ

دلکشی حسن میں نئی سی ہے
اور رنگ بہار دیرینہ

عشق کا سلسلہ ازل سے ہے
رشتہ طوق و دار دیرینہ

کاٹ کر رکھ دیا ہے لوگوں نے
اک شجر سایہ دار دیرینہ

نشہ قرب تو اتر ہی گیا
رہ گیا ہے خمار دیرینہ

ہو سفر رنج یا مسرت کا
یاد آتا ہے پیار دیرینہ

دشمنوں کی صفوں میں شامل ہے
وہ میرا یار غار دیرینہ

زندگی چوتھی سمت بھی نکلے
ٹوٹ جائے حصار دیرینہ

ایک سوکھا ہوا گلاب کا پھول
وقت کی یادگار دیرینہ

دو شعر

اکیلی شام بہت ہے اداس کرنے کو
کسی کا نام بہت ہے اداس کرنے کو

کبھی تو سانحے دل پر گراں نہیں ہوتے
کبھی سلام بہت ہے اداس کرنے کو

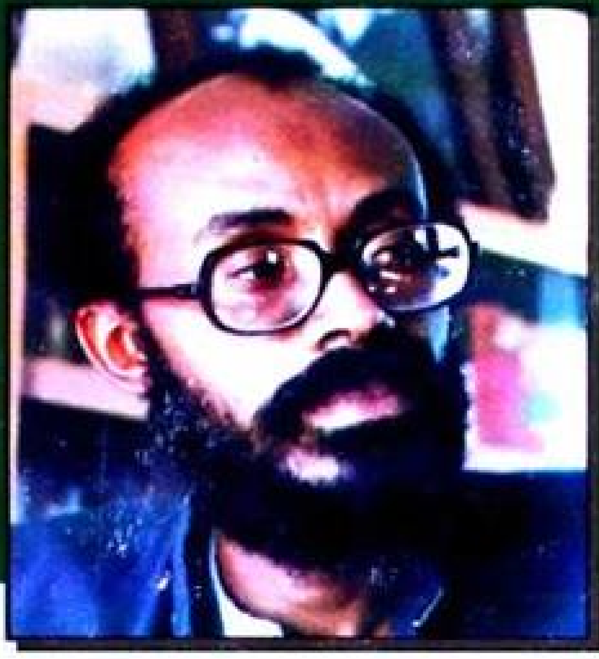

ن - م - دانش 21 مارچ 1958 کو کراچی کی قدیم بستی لیاری میں پیدا ہوئے اوکھائی میمن سیکنڈری اسکول کھارادر سے میٹرک اور وفاقی گورنمنٹ اردو کالج سے گریجویشن کے بعد جامعہ کراچی ایم اے اردو میں فرسٹ کلاس فرسٹ میں پاس کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ زمانہ طالب علمی میں بحیثیت مقرر پاکستان بھر کے تعلیمی اداروں سے ٹرافیاں جیتیں اور اس کے ساتھ مختلف اخبارات اور ادبی رسائل میں مضامین اور کہانیاں لکھیں ان کی شاعری ملک کے مقتدر ادبی پرچوں میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہی ہے۔ بچے' تتلی' پھول ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے اس مجموعے میں 1981ء سے لے کر 1988ء تک کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ان دنوں وفاقی گورنمنٹ اردو کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

N 969 - 441-020-7

Price:Rs.